# کشمیری پنڈت

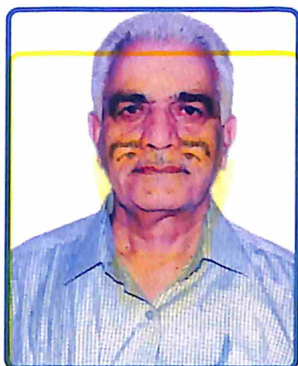
# داستانِ دار و رسن

پیارے لال کول بڈگامی

# کشمیری پنڈت

# داستانِ دار و رسن

پیارے لال کول بڈگامی



## پیارے لال کول بڈگامی

پیارے لال کول بڈگامی

قصبہ بڈگام میں 7/جون 1945ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔اے، بی۔ایڈ کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کیا، ماڈرن پرشن ڈپلوما جے۔این۔یو دھلی سے حاصل کیا۔1985ء میں سٹیٹ لیول سمینار میں اوّل رہے اور 1995ء میں سٹیٹ ایوارڈ حاصل کیا۔سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے بحیثیت لیکچرار سبکدوش ہوئے۔تصنیفات میں خاص طور پر:

۱۔ ''تعلیم تشکیل نو کا پوسٹ مارٹم'' 1982ء

۲۔ ''تعلیمی زاوے'' 1985ء

۳۔ ''ہندو مسلم اِتحاد کا تابناک ماضی، تاریک حال اور غیر واضح مستقبل'' 1992ء

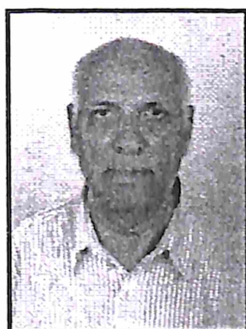
۴۔ ''کشمیری پنڈت بجھتے چراغ'' 2013ء

نام کتاب : کشمیری پنڈت : داستانِ دار و رسن
مصنف : پیارے لال کول بڈگامی
سنِ اشاعت : 2016ء
قیمت عام : سو روپیہ
لائبریری ایڈیشن : دوسو روپیہ
کمپوزر : رِنکو کول 9419136369#
ترتیب و تشکیل : مُصنف
مطبع : :جنڈیال پرنٹنگ پریس موہندر نگر نہر روڈ جموں

کتاب ملنے کا پتہ:
۱۔ کنگن ٹریڈرس، اُودھے والا بوڑی جموّں۔
۲۔ نیوز ایجنسی، توپ کوارٹرس، جموّں۔
۳۔ نیوز ایجنسی، تالاب تِلو چوک، جموّں۔
۴۔ کتاب گھر، کلچرل اکیڈیمی، جموّں۔

# فہرست

پیشِ لفظ



# تاریخ کے تناظر میں

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دِل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
تو اِسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، ہردم رواں پیہم دواں ہے زندگی

اقبال

معرکہ حیات میں جتنے نشیب و فراز ہماری قوم یعنی کشمیری پنڈتوں نے دیکھے بہت کم قوموں نے دیکھے ہیں۔ کوہ ہمالیہ کے سر بہ فلک پہاڑوں کی آغوش میں آسودہ کشمیر کی وادیٔ اپنی اساطیری داستانوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جسکے بہت سارے گوشے کھدرے مرموزیت میں پڑے ہیں۔ اُسکا عشر عشیر جو ہم تک پہنچا ہے وہ نامور مورخ کلہن پنڈت کی شہرہ آفاق تاریخ ''راج ترنگنی'' کے ذریعے ہی پہنچا ہے۔ پانچ ہزار سال کی کشمیری قوم کی تاریخ کو جسطرح کلہن پنڈت نے ضبط تحریر میں لایا اُسکی مثال دُنیا کی دیگر اقوام میں کم ملتی ہے۔

قدیم کشمیر ہندو تہذیب اور ثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔ سنسکرت زبان اور ادب کے پرچار میں اُسکا خاطر خواہ رول رہا ہے۔ معابد کی تعمیر میں کشمیری معماروں نے یدِ طولیٰ حاصل کر رکھا تھا۔ چنانچہ اونتی پورہ، مارتنڈ، وانگت، پرہاسپورہ، پٹن اور بونیار میں ہمیں عبادت گاہوں اور مندروں کے جو کھنڈرات ملتے ہیں اُن سے اصل عمارت کی شان اور شکوہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدیداست صنا دید عجم را

کشمیر میں جہاں جہاں بھی جامع مسجدیں بنی ہیں اِن میں بیشتر کی بُنیاد اصل میں مندروں کی بنیاد پر مبنی ہے۔ چنانچہ مندروں اور عبادتگاہوں کو مسمار کر کے اُن کے کھنڈرات پر اسلامی طرز کی مسجدیں اور عبادت گاہیں

بن گئی ہیں۔

قلمرو کشمیر کے مقتدر ہندو بادشاہوں نے اِسکی سرحدیں دور دور تک پھیلا رکھیں تھیں۔ کپی سا (کابل) اور گندھارا (قندہار) کشمیر کی سلطنت کا حصہ تھے۔ راجہ للتا دتیہ نے جنوبی اور جنوب مشرقی ترکستان یعنی کاشغر، یارکند اور اروچی اور پھر تبت تک اپنی امپراطوری کی سرحدیں پہنچا دی تھیں۔ سلطان شہاب الدین نے جنوب کی طرف لشکرکشی کر کے دریائے ستلج تک سرحد پہنچا دی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں کشمیر قدیم شاہراہ ابریشم کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور تجارت کا اہم مرکز تھا۔ چنانچہ کشمیر سے زعفران، ادویات، کاغذ اور دستکاری کی اشیا برآمد ہوتی تھیں۔ ترکستان سے ریشم، اون، گھوڑے اور پارچہ جات درآمد کئے جاتے تھے۔ یارکند ایک بڑی تجارتی منڈی کے طور جانا جاتا تھا۔ بخارا میں آج بھی بازار ہندوان کے نام سے ایک تجارتی مرکز باقی ہے۔ یہ ہندی تاجروں کی بڑی سرائے تھی۔ چنانچہ شاہراہ ابریشم پر دیگر اقوام کے علاوہ کشمیری تاجر پیشہ لوگ جوق در جوق اپنے کاروانوں پر مال لایا اور لے جایا کرتے تھے۔

شاہراہ ابریشم کا کشمیر کے حوالے سے ایک اور اہم رول رہا ہے جب مہاتما گوتم بُدھ نے مت لایا تو ہندوستان میں اسکے پروکار بڑی تعداد میں بُدھ مت کی ترویج اور تشہیر کیلیئے آمادہ ہوئے۔ چنانچہ اُس زمانے کے کشمیریوں نے بھی بُدھ مذہب کو لبیک کہا اور نہ صرف عوام نے بُدھ مذہب اختیار کیا

بلکہ کشمیر کے راجاوں اور اُنکی رانیوں نے بھی یہ دین قبول کرنے میں پہل کی۔ جب راجا نے نیا دھرم قبول کیا تو درباری لوگ اور امرا وزرا نے بھی اپنے حکمران کی تقلید میں بُدھ مذہب کو بلا جبر و اکراہ قبول کیا۔ پھر کیا تھا جب حکومت کی طرف سے تشویق ہوئی تو بُدھ مت کا پرچار شد و مد سے ہونے لگا۔ راجاوں، راج کُماروں اور رانیوں کے علاوہ شہزادوں اور امیروں وزیروں سبھی نے بُدھ مذہب کی عبادت گاہیں یعنی وہار Vihar تعمیر کروائے۔ بہت ساری رانیوں نے اپنے ذاتی خزانہ سے رقومات فراہم کیں اور وہار بنوائے جن میں بہت ساروں کے نشان اور نام آج تک باقی ہیں۔ ''وِہار'' کا لفظ بگڑ کر کشمیری میں ''ہار'' اور ''یار'' بن گیا جو عبادت گاہ پسوند Suffix بن کر رہ گیا۔ گنپت وہارا سے گنپت یار اور سوما وہارا سے سوم یار بن گیا۔

لیکن ہندو دھرم کی دریا دلی اور ہمزیستی کے جذبہ کی داد دینی ہوگی کہ اُس نے لوگوں کے بُدھ مذہب قبول کرنے کی خواہش کو کبھی باعث تنازعہ نہیں مانا۔ اگرچہ ان دو ادیان کے فلسفہ اور نقطہ نظر میں اختلاف بھی تھا اور بدھ مت بُت پرستی کا قایل نہیں تھا۔ بلکہ بُدھ مت خدا کے وجود پر بھی شک اور تردید کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اِس اختلاف فاحش کے باوجود کشمیر میں دونوں مسلک ہمزیستی کے اصول کے پابند تھے۔

ہندوستان میں مہاراجا اشوک کی حکومت برسر اقتدار آئی تو اِس عظیم المرتبت بادشاہ نے بُدھ مت قبول کر کے اِسکی ترویج اور اسکے پرچار

کی طرف پوری کوشش مبذول کی۔ بُدھ بھکشوؤں کو ایشیا کے مختلف مما لک میں مبلّغ بنا کر بھیجا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں سنگاپور، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ملیشیا، تائی وان، برما، نیپال اور دیگر مما لک میں بُدھ مت کے مبلّغ تبلیغی کاموں میں ایک دوسرے پر گوئے سبقت لینے لگے۔ کشمیر میں بھی بُدھ مت کے آچاریہ اس نئے اور امن پسند دین کے فروغ اور توسیع کیلئے کمر بند ہوئے۔ آچاریہ کمل شری نے مغرب زمین میں پہلے تو آج کے پشاور میں اپنا تبلیغی مرکز قائم کیا۔ چنانچہ اس شہر کا قدیم سنسکرت نام پشکلاوتی تھا۔ بُدھ مت کا دوسرا اہم مرکز موجودہ افغانستان میں بلخ بامیان کے مقام پر دایر ہوا۔ چنانچہ بامیان میں مہاتما بُدھ کا سب سے بُلند قامت مجسمہ کوئی تین سو فٹ اونچا بامیان کے سنگلاخ پہاڑ میں کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ طالبان کے مخمصہ میں ناہنجار متعصب طالبان نے اِسے توپ کا نشانہ بنا کر آسیب زدہ بنا دیا۔

بُدھ مت کے کشمیری علما نے کشمیر سے حرکت کر کے اور شمال مغربی سرحدی صوبہ سے گذر کر افغانستان اور پھر ترکستان سے ہوتے ہوئے منگولیا اور منچوریا اور تبت کے علاقوں میں مہاتما بُدھ کا پیغام پہنچایا۔ مرکزی ایشیا یا ترکستان کے شہر پنجی کنت میں مہاتما بُدھ کا دُنیا میں سب سے بڑا مجسمہ چونے اور مٹی کا بنا ہوا ملا جسکی لمبائی بیس فُٹ کے قریب ہے۔ یہ مجسمہ تاجکستان کے مرکز دوشنبہ میں سرکاری عجائب گھر میں رکھا گیا ہے۔

تبت اور لداخ میں کشمیری بُدھ مت کے علما نے جس لگن اور انہماک سے دین بودا کی تبلیغ کی اِسکی مثال نہیں ملتی۔ آج بھی تبت کے عجائب گھر میں کشمیری عالموں کے تحریر کردہ بُدھ مت کی دینی اور فلسفانہ دستاویزات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بُدھ مت کے پرچار کی اہمترین خدمت یہ ہے کہ یہ مذہب تشدد اور تلوار زنی کے بغیر معرض وجود میں آیا۔ امن اور آشتی کا پیغام جس طرح بُدھ مت نے پھیلایا اِس طرح اور کسی بھی مذہب نے نہیں پھیلا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں عوام نے عدم تشدد کو اپنی زندگی کا شعار بنایا اور یہ خصلت آج تک اِن لوگوں میں چلی آ رہی ہے۔

عالم ہست و بود کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی بھی چیز کو ثبات نہیں۔ بقول شاعر:

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

عظیم الشان سلطنتیں اُبھر کر نیست نابود ہو چکی ہیں۔ بادشاہت کا نام تاریخ کی کتابوں میں رہ گیا۔ چنگیز اور تیمور کی عالم سوز ترک تازی اب تاریخ کے صفحوں کی زینت بن کر رہ گئی ہے۔ نہ چنگیزی قلمرو ہے نہ تیمور سلطنت ہے۔ وقت اپنا کام کرتا ہے۔

چنگیزی و تیموری مشتی زغبار من — ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
اِنسان و جہان او از نقش یگار من — خون جگر مردان سامان بہار من
فن آتش سوزانم من روضۂ رضوانم

کشمیر کی امپراطوری اپنے زوال کی طرف بڑھنے لگی۔ چودھویں صدی عیسوی کے آس پاس کشمیر کے معاشرے میں دراڑ پڑنے کے اثار دِکھائی دئے۔ معاشرے میں تنزل آنے لگا۔ معیشت دن بدن کمزور ہونے لگی اور حکومت کی مرکزیت میں خلل آنا شروع ہُوا۔ اُدھر عربستان سے اسلام کا آغاز پورے زور وشور سے ہُوا۔ تلوار کے دُھنی عربوں نے اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر قرب و جوار میں فتوحات شروع کیں۔ صدا اسلام کے اِبتدائی تیس چالیس برسوں میں عربوں نے وسطی ایشیا ہی نہیں بلکہ ترکستان اور ہندوستان اور چین تک کی سرزمیں کو اپنے گھوڑوں کے ٹابوں کے تلے روندھ دیا۔ کشمیر میں وہ لشکر لے کر تو نہیں آئے پر دین اسلام کے مبلغ ایران اور ترکستان سے ہوتے ہوئے کشمیر میں پہنچے۔ چونکہ یہ خط پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اور آیاب اور ذہاب کی راہیں مسدود تھیں اسلئے لوگ ایک نئے مذہب اور اسکی تعلیمات کو ایک اہم معاشرتی بدلاو سمجھ کر دین اسلام کے گرویدہ ہو گئے۔ یوں تو لوگ اسلام کی طرف اپنی رضا سے راغب ہوئے لیکن اگر کہیں مزاحمت ہوئی بھی تو اسلامیوں نے اِسکو بزور باز وفرد کیا البتہ کچھ ایسے مسلمان حکمران بھی گذرے جنہوں نے اہل ہندو کو ترک دین کرنے کیلئے زور بازو کا استعمال بھی کِیا۔ وہ ایک خونچکان داستان ہے۔ اور اس سے بڑھکر دلدوز بات یہ ہے کہ قدیم ثقافتی ورثہ کو منہدم کر دیا گیا۔ عظیم الشان عبادت گاہوں، مندروں اور اماکن کو مسمار کر کے اِن کے

باقیات پر مسجدیں یا خانقاہیں تعمیر کیں۔

کشمیر میں اسلام کے آنے کے بعد سب سے بڑی تبدیلی جو نظر میں آنے لگی وہ یہ تھی کہ مسلمان صدیوں تک اپنے قدیم ورثہ سے بہت دور ہونا نہیں چاہتے تھے بلکہ ایک ملی جلی روایت کو تشکیل دینے کی طرف رغبت رکھتے تھے جو بعد میں رشی مت اور صوفی مت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ عام طور پر کشمیر کے ہندو دور کے رشی منی بُزرگوں کے استھاپن صوفی آستانوں میں تبدیل ہو گئے۔ لوگوں کی اِن بُزرگوں کے تیئں عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رشی بُزرگوں کے نام اسطرح بدلے گئے جو اسلامی اور ہندو دونوں کے باہمی امتزاج کی مثال تھی۔ نُند ریشی جو مسلم فرقہ میں عزت اور احترام پا چکا اصل میں سہزانند نام کا ہندو ریشی تھا۔ نام کا پہلا حصہ چھوڑ کر دوسرا حصہ استعمال ہوا اور اسطرح سہزانند رشی، نُند ریشی بن گیا۔

اسلامی دور کے دوران کشمیر اُسی طرح اغتشاش اور باہمی جنگ و جدل کے شعلوں میں لپٹا رہا جس طرح ہندو دورِ حکومت میں اکثر ہُوا کرتا تھا۔ فتنہ اور فساد اُنکی سرشت میں ہے۔ اِس میں مذہب کا کوئی خاص عمل دخل نہیں۔ کشمیریوں کی طوطا چشمی اور احسان فراموشی کے پیچھے دراصل اقتصادی اور معاشی وجوہات ہیں۔ اقتصاد معیشت اور ایک خط کا جغرافیہ اور آب و ہوا لوگوں کی افتادِ طبع کے بنانے اور بگاڑنے میں موثر ہوتے ہیں۔ سرد سیر علاقہ ہونے کی وجہ سے کشمیر میں بالعموم ایک سال میں ایک فصل

اُگائی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی آفت سماوی جیسے سیلاب، سوکھا یا بھونچال نہ ہوا تو لوگ ایک سال کی فصل کی نایابی کے خطرہ سے محفوظ رہتے۔ اسلئے اقتصادی بدیقینی اور بے یقینی نے ان کی سرشت میں خودغرض اور حیلہ گری کی خصلت پیدا کی۔ بُری خصلتوں سے خلاصی پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تجارت اور کاروبار انسانوں کی اندر وقار، خوداعتمادی اور انسانی سوجھ بوجھ پیدا کرتے ہیں۔ کشمیر میں تجارت محدود اور مشکل حالات میں ہی ہوا کرتی تھی۔ اگر راہیں کھلی ہوتی۔ سال بھر آمد و رفت عام طور پر ہوتی تو تجارت کو فروغ ملتا اور لوگوں میں نئی سوچ اور نئی فضا خوداعتمادی کو بڑھاتے۔ ایسا نہیں ہوا۔

ہندوستانی حکم فرماوں نے ایک نہایت سمجھداری کا کام تو کیا لیکن بہت تاخیر کے بعد۔ کاش یہ کام آج سے پچاس برس پہلے کِیا گیا ہوتا اور وہ ہے کشمیر میں ریل بچھانے کا کام۔ اگرچہ یہ بہت دُشوار اور بھاری رقومات کے خرچ پر ہی ہوسکتا ہے تاہم چونکہ حکومت نے اِسکا آغاز کِیا ہے اور ریلوے کا ایک بڑا حصہ تیار کیا گیا ہے یہ کشمیریوں کی خصلت کو بدلنے میں بہت ہی موثر ثابت ہوگا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ریلوے لائن کے چالو ہونے کے بعد پہلی بار کشمیریوں کو باہر کی دُنیا کے ساتھ لین دین اور ملنے جلنے کے رموز اور غوامض سمجھ آئینگے۔ چونکہ وہ کوزے میں بند رہے ہیں اسلئے سازشوں اور تخریب کاریوں کے علاوہ اور کچھ سوچ نہیں سکتے ہیں۔

کشمیریوں کی خود بے اعتمادی اور دوسروں کی پا ے مردی سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی عادت نے ان پر طرح طرح کے مصایب ڈھائے ہیں۔ دور سلاطین میں ہی نہیں بلکہ ہندو راجاوں کے دورِ حکومت میں بھی اگر کوئی باغی اپنے کو طاقت ور حکمران کے ہاتھوں شکست فاش کا احساس کرتا تو وہ وادیٔ سے پہاڑوں کو پھیلانگ کر پونچھ، راجوری، کشتواڑ اور حتی پنجاب کے بعض علاقوں میں پناہ لے کر پھر سے جنگ کی تیاری کرتا۔ پیر پنچال کی سر بہ فلک چوٹیوں کے پیچھے پناہ لینا ہماری تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ چنانچہ اِس اقدام اور حکمت عملی کا ضرر رسان نتیجہ یہ نکلا کہ بعض عناد اور دشمنی کا جذبہ کشمیریوں کی خصلت کا نعم البدل بن گیا۔ نہ ساری عمر بلکہ نسل بہ نسل فوجی سرداروں اور پُر قدرت منصبداروں کے درمیان دُشمنی چلتی رہی اور اِسکا نہایت بُرا اثر عوام پر پڑتا رہا۔

سلاطین کے عہد حکومت میں کشمیری منصبداروں کے درمیان رسہ کشی اور باہمی بغض اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ ایک جماعت ہمایوں بادشاہ کے دربار میں فوجی کمک کی درخواست لے کر پہنچی تو دوسری طرف کشمیریوں کی ایک اور جماعت شیر شاہ سوری کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ انہیں فوجی مدد دی جائے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں مولانا صرفی کی قیادت میں ایک وفد دھلی دربار میں پہنچا اور یہ شکایت کی کہ شیعہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے سلاطین چک نے کشمیر کے سنی مسلک کے لوگوں پر جور و جفا روا رکھا ہے اسکا

انسداد کیا جائے۔ اکبر نے کشمیر پر فوج کشی کا حکم صادر کیا۔ نادان کشمیری یہ سمجھے کہ مغل افواج مذہب کی بنا پر انکی مدد کیلئے کشمیر آئی ہے۔ حقیقت امر یہ تھا کہ مغلوں نے جو صوبہ دار یعنی گورنر مقرر کیئے ان میں کئی شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیریوں کو سمجھ نہ آئی کہ یہ مغل حکومت آمرانہ حکومت ہے اُسے مذہب اور فرقہ سے کوئی لینا دینا نہیں۔

سلطاین کے عہد میں امن و امان نام کی کوئی چیز کشمیر میں موجود نہ تھی۔ طوائف الملوکی کا عالم تھا۔ ڈامروں، بمبوں اور کھکھروں نے کسی بھی فرقہ کو امن اور چین سے رہنے نہ دیا۔ اور نہ حکومت وقت نے ملکی آبادکاری کا کوئی اہم منصوبہ ہاتھ میں لیا۔ کشمیر سیلاب میں مبتلا ہوا یا خشک سالی میں۔ غلہ کا قحط ہو یا شدید سرما سے لوگ نڈھال اور بدحال ہوں سلاطین کو اِس سے کوئی لینا دینا نہ تھا۔

آخر مغلوں نے مقامی حکمرانوں کو ہٹا کر اپنی حکومت قائم کی۔ ان کے صوبہ دار باج وخراج کی جمع آوری میں مصروف تھے۔ جو گورنر بھاری رقم خزانہ عامرہ میں جمع کرتا اُسے کشمیر کے سیاہ وسفید پر اپنی حکومت اور اپنا حکم چلانے کی پوری آزادی تھی۔ عیاشی اور خوش گذرانی میں ان کا کوئی مخل نہیں تھا۔ بسا اوقات جس قدر مالیہ صوبہ دار اکھٹا کرتا اُسکا اچھا خاصہ حصہ وہ اپنے لئے وقف کرتا اور اس طرح کشمیری کسانوں اور محنت کشوں کا استحصال ہوتا رہا۔

افغانوں نے غالباً چالیس پچاس سال حکومت کی۔ وہ مغلوں کے بعد برسر اقتدار میں آئے اور مالیہ وصولی میں انہوں نے طرح طرح کے نئے ظلم ڈھائے۔ بے رحم اور سفاک افغان صوبہ داروں نے کشمیر کو جی بھر کر لوٹ لیا۔ اور پھر اُن کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر ایک کشمیری وفد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہو کر اُسی طرح مذہب کے نام پر داد و بیداد کرنے لگا۔ جس طرح اکبر کے زمانے میں صرفی کی قیادت والے کشمیری وفد نے کی تھی۔

سکھ فوج نے افغانوں کو پسپا کر دیا اور کشمیر پر اپنی حکومت قائم کی۔ سکھوں کی حکومت تیس پینتیس برس سے زیادہ نہ رہی۔ اگرچہ سکھوں نے مذہبی رواداری میں دخل اندازی کرنے سے احتراز کیا تاہم انہوں نے بھی مالیات کی وصولی میں زور و جبر کی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ 1846ء میں معاہدہ امرتسر کے نتیجہ میں کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ کے اقتدار میں چلا گیا۔ ڈوگرہ حکومت نے بھی مالی استحصال کی رسم برقرار رکھی۔ گلگت، بلتستان اور لداخ و تبت کی مہم ڈوگرہ حکومت کے دوران جاری رہی۔ بہرحال ڈوگرہ حکومت نے مذہبی تعصب سے کنارہ کشی کر کے حکومت کی۔ اسکی دو وجوہات تھیں۔ اگرچہ ڈوگرہ حکومت خود مختار تھی تاہم ہندوستان پر برطانوی سامراج چھایا ہوا تھا اور ڈوگرہ کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے جس سے برطانوی نو آبادی حکومت برانگیختہ ہو جاتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ برٹش انڈین

حکومت نے کشمیر پر کڑی نگرانی رکھی مبادا سویت روس جنوب کی طرف اپنا اثر رسوخ اور اقتدار بڑھائے اور اس سے برطانیہ کی ہندوستان کی نوآبادی کی سیکورٹی خدشہ میں پڑ جائے۔ اسلئے ڈوگرہ حکومت ہمیشہ برطانوی حکومت کے خوف کے سایہ میں پلتی رہی۔ ڈوگرہ حکومت نے ایک سو سال تک کشمیر میں حکومت کی۔ اگرچہ یہ شخصی راج کا دورہ تھا تاہم چونکہ ڈوگرہ حکمران ہندو مذہب کے پروکار تھے اور ہندو تہذیب و تمدن کی پیش رفت میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ اسلئے اس ایک صدی میں کشمیر کے پنڈتوں نے مدت مدید کے بعد تحفظ میں رہکر چین اور سُکھ کی سانس لی۔ کشمیری پنڈتوں کی طویل تاریخ میں یہی ایک صدی ہے یعنی 1847ء سے لے کر 1947ء تک جب کہ یہ لوگ سُکھ چین سے عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتے رہے ورنہ اس سے پہلے اور اسکے بعد اُنکی کہانی ایک دردناک اور مایوس کُن کہانی ہے۔

ڈوگرہ دورِ حکومت میں کشمیری پنڈت چھوٹی موٹی سرکاری نوکریاں کرتے تھے۔ انکی بڑی تعداد تعلیم یافتہ تھی اور ڈوگرہ حکومت کو سرکاری ادارے چلانے کیلئے پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت تھی۔ عام کشمیری مسلمان تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ باسودا مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ الزام کہ ڈوگرہ حکومت ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتی تھی پوری طور پر دُرست نہیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ ڈوگرہ خاندان کا آخری حکمران تھا۔

انیسوں صدی کے آواخر میں ہندوستانیوں میں آزادی کا نعرہ بُلند کرنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ کئی روشنفکر ہندوستانیوں نے انگلستان کی دانشگاہوں اور علمی اداروں میں کسب علم کیا۔ وہ وہاں کے معاشرے سے جو جمہوریت کے اصولوں کے تحت چلایا جارہا تھا باخبر ہوئے۔ انہوں نے اپنی اُنجمن بنالیں اور ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ گاندھی جی بھی اُسی دور کی پیداوار ہے۔ دادا بھائی نوروز جی۔ اینی بسنت (Annie Besant) موتی لعل نہرو، گاندھی جی پہلی پود کے تھے جو انگلستان کے طرز خلوص سے متعاثر ہوئے اور ہندوستان میں سیاسی آزادی کے اولین مفکروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسطرح آزادی خواہ کانگریس سیاسی پارٹی معرض وجود میں آئی۔ آزادی کی مہم آغازِ کرنے اور اُسے سارے ہندوستان میں پھیلانے کا سہرا کانگریس پارٹی اور اسکے قداور سیاست دانوں کے سر ہے جن میں گاندھی جی صفِ اول کا مجاہد تھا۔

کشمیر میں کانگریس کا بول بالا نہیں تھا کیونکہ مسلم لیگ کانگریس کو ہندووں کی جماعت شمار کرتی تھی جو دراصل غلط فہمی تھی۔ مسلم لیگ نے قومی نہیں بلکہ اسلامی ایجنڈا اپنا رکھا تھا اسلئے کشمیر کی مسلم کانفرنس بھی مسلم لیگ کے نقش قدم پر چل کر صرف مسلمانوں کی سیاسی تحریک سے منسلک ہو چکی تھی۔ مسلم کانفرنس پر میر پور جموں کی مسلم لیڈر شپ کا غلبہ تھا۔ شیخ عبداللہ نے علی گڈھ سے بی۔اے With honours اور ایم۔اے کیمسٹری میں

پاس کیا۔ کشمیر میں سکول ٹیچر لگ گئے لیکن جلدی سیاسی میدان میں اُتر کر اپنی زندگی کو کشمیر کیلئے وقف کیا۔

1939ء میں شیخ عبداللہ نے مسلم کانفرنس سے کنارہ کشی کی اور نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ مسلم کانفرنس سے دوری کی اصلی وجہ یہ تھی کہ شیخ عبداللہ میرپور اور جموں مسلم قیادت کے تابع رہکر سیاست نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شیخ عبداللہ محکم انا رکھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شیخ عبداللہ نے بھانپ لیا کہ کشمیری نہ بولنے والے جموں اور مظفر آباد کے لوگ اُسکی قیادت کو اتنی جلدی اور اتنے ولولہ سے قبول نہیں کرینگے جتنے ولولہ سے کشمیری نسل کے لوگ کرینگے۔ چونکہ اُس نے اپنی الگ ڈگر اختیار کی تھی اسلئے ضروری تھا کہ وہ میرپوری قیادت سے نظریاتی اختلاف کا اظہار کرتا۔ اِسی مدعا کو مدِنظر رکھ کر شیخ عبداللہ نے دو قوموں کی تھیوری کے عوض ہندو مسلم سِکھ اتحاد یعنی سیکولرازم کا نعرہ بُلند کیا۔ شیخ عبداللہ کیا واقعی سیکولر تھا یا نہیں ایک بچگانہ سوال ہے۔ ہندوستان کیا برِاعظم کی ساری سیاست مذہبی نقطہ نظر پر مبنی رہی ہے۔ مسلم لیگ نے تو اسلامی سیاست کو برملا قبول کیا اور اسکا اعلان بھی کیا لیکن کانگرس کا سیکولرازم دورِحاضرہ کی سیاست کی تاریخ کا ایک بڑا سوال ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے کانگریس پارٹی میں اپنا خاص مقام بنالیا تھا۔ نہرو کی سب سے بڑی قوت اسکی حب الوطنی تھی۔ چونکہ وہ کشمیری النسل

تھا اسلئے اِس حوالے سے وہ ہندوستان کی کسی جاتی، قومیت اور علاقہ سے جذباتی طور پیوست نہیں ہو چکا تھا۔ ہاں کشمیر کے ساتھ اسکا جذباتی تعلق تھا اور یہ جذبہ بڑی حد تک اسکی کشمیر پالیسی میں منعکس ہوتا رہا۔

کئی تبصرہ نگار نہرو اور شیخ کے درمیان بے حد قرابت اور یگانگت کی صورت پر قلم فرسائی کر چکے ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ کیا اصولوں کی ہم آہنگی اور نظریات کی مطابقت ہی وہ عنصر ہیں جو ان دو اہم شخصیتوں کو آپس میں جوڑ چکے تھے ایک دِلچسپ بحث ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو نے کشمیر اور کشمیر کے لوگوں کے حوالے سے شیخ عبداللہ کو صدق دلی سے اپنی اور کانگرس کی حمایت پیش کی وہاں شیخ عبداللہ نے محدود کشمیر مسلم مفادات اور ایک حد تک ذاتی مفادات یعنی قیادت کی مقصد کی ہی آبیاری کی۔

شیخ عبداللہ کی نہرو کے ساتھ قرابت تاریخ کشمیر کا المیہ ہے۔ کشمیر کی دورِ معاصر کی تاریخِ ضبطِ تحریر کرنے والوں کو شیخ عبداللہ کی ذہانت ابہام اور سیاسی سوجھ بوجھ کی داد دینی ہوگی۔ اس شخص میں اگر کسی بات کی کمی تھی تو وہ تھی اپنے سیاسی مخالفین کے تئیں بے انتہا عدم برداشت کا عنصر۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے سیاسی مخالفین کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ یہی ایک تباہ کُن عادت تھی جس نے اُسے اپنے سیاسی حریفوں کے ساتھ بذریعہ مذاکرہ اور مجادلہ دست و پنجہ ہونے سے باز رکھا۔ اس نے میر واعظ مولوی یوسف شاہ

کو1948ء میں کشمیر چھوڑنے پر مجبور کیا ہر چند کہ شیخ عبداللہ کو قاید بنانے میں میر واعظ کے گھرانے کا بڑا رول رہا ہے۔ علاوہ ازین میر واعظ یوسف شاہ ہی نہیں بلکہ پورا میر واعظ کا خاندان اولین درجے کا انسان دوست اور کشمیری سنت کا علم بردار تھا۔ کشمیری ہندوؤں کے تیئں میر واعظ خاندان کا سلوک بے حد منصفانہ اور انسان دوستی کا تھا چنانچہ آج بھی راجوری کدل سری نگر کے ہندو باشندے میر واعظ خاندان کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں۔

ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو کی دریا دلی اور فہم فراست پر کچھ کہنا نہیں ہے لیکن کشمیر کی دور معاصر کی تاریخ بتاتی ہے کہ نہرو نے شیخ عبداللہ کی ٹوکری میں سارے انڈے ڈال کر کشمیر پالیسی کو بڑی حد تک ناپائداری اور تزلزل کی حالت میں ڈال دیا۔ اُسے شیخ عبداللہ بر اصرار کرنا چاہے تھا کہ میر واعظ مولوی یوسف شاہ اور میر واعظ خاندان کے رسوخ اور ان کے تیئں لوگوں کی عقیدت کو مدِ نظر رکھ کر مولوی یوسف شاہ کے ساتھ مراسم بڑھانے کا اقدام کرنا چاہئے تھا اور اگر ایسا کرنے میں شیخ عبداللہ ناراض بھی ہوتا تو حق اور انصاف اور سیاست مدن یعنی ڈپلومیسی کے اصولوں کے تحت یہ ناراضگی لازمی طور مول لینی چاہئے تھی۔

شیخ عبداللہ نے نہرو کو حد سے زیادہ گمراہ کیا۔ آخر کار شیخ میں وہ ذہانت تھی کہ گمراہ کر سکا۔ گمراہی کی چند ایک مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اول یہ کہ نہرو کو میر واعظ خاندان سے بدظن کیا۔ یہ کہکر کہ میر واعظ کا خاندان

مسلم لیگ اور فرقہ پرست خاندان ہے۔ درصورتیکہ حقیقت اِسکے برعکس تھی۔ دوسری مثال یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے نہرو کو باور کرایا کہ ریاست میں ایک بھی مرد اسکی پالیسی یا نیشنل کانفرنس سے اختلاف نہیں رکھتا۔ تیسری مثال یہ تھی کہ شیخ نے نہرو کو باور کرایا کہ وہ کشمیر کا الحاق حتمی اور فیصلہ کُن مانتا ہے اور یہ کہ اُسے کشمیر کی دونوں ملکوں سے آزادی جیسا کوئی نظریہ نہیں ہے۔

بہرحال 1953ء میں شیخ عبداللہ کی معزولی اور پھر قید و بند نے ثابت کیا کہ شیخ اور نہرو کے درمیان دوستی اور فکر کی ہم آہنگی جیسا کوئی ڈراما نہیں تھا محض سیاست تھی اور دونوں فریق سیاسی پینترا بدلتے جا رہے تھے۔ اتنی سوانح بنام آتش چنار میں شیخ کہتا ہے کہ نہرو بڑا زبردست شکاری ہے۔ لیکن رضاحت نہیں کرتا کہ وہ خود کس طرح اس شکاری کے دام فریب میں پھنس گیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ شیخ حد سے بڑھ کر اپنی انا کا قایل تھا۔ اور اسکو معلوم تھا کہ پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد اسکی انا اور اسکی قدآور شخصیت اپنی آن و بان اور قدر و منزلت کھو سکتی ہے اور پاکستان میں اسکی قدر رتی بھر بھی نہیں رہ جائے گی۔ اسکے برعکس وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو ذرا دھمکا سکتا ہے کیونکہ ہندو فطرتاً مسلمان سے دب کے رہ جاتا ہے۔ اسلئے الحاق ہند میں اسکی انا پھل پھول سکتی تھی جبکہ الحاق پاکستان میں یہ بالکل دب کر رہ جاتی۔

بہر حال 1953ء کے واقعہ نے کشمیر کی سیاست کا ایک نیا اور غیر متوقع باب کھول کے رکھ دیا۔ عین ممکن تھا کہ شیخ کی اسارت کے بعد ہی کشمیر میں وسیع پیمانہ کی بدامنی اور افراتفری پھیل جاتی اور جو کچھ 1990ء میں ہوا وہ 1953ء تا 1954ء مین ہی ہو جاتا۔ ایسا نہ ہوا کیونکہ اس وقت کشمیریوں کی خوش قسمتی سے کشمیر کا مجاہد اول اور مسیحا بخشی غلام محمد برسرِ اقتدار آیا۔ اگر بخشی صاحب کی جگہ کوئی دوسرا قاید ہوتا وہ حالات کو ہرگز کنٹرول میں نہیں لا سکتا تھا۔

افسوس یہ ہے کہ آج تک بخشی غلام محمد پر کوئی بھی سیر حاصل کتاب چھاپی نہیں گئی۔ یہ کشمیر کا ایک المیہ ہے کہ کشمیر کے اس محبّ وطن قاید کے ساتھ نہایت غیر منصفانہ اور احمقانہ سلوک روا رکھا گیا۔ اسکے ملزم صرف شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس ہی نہیں بلکہ کانگریسی بڑھ چڑھ کر ہیں جنہوں نے بخشی کی صدق دلانہ خدمات کو نظر انداز کر کے اُسے گمنامی کے خرابہ میں دھکیل دیا۔

اگر کشمیر کو کسی نے قرون وسطی سے نکال کر دورِ جدید میں لایا، اگر کشمیر میں پہلی بار تعمیر اور ترقی کو کسی نے فروغ دیا، اگر کشمیر میں کسی نے حقیقت میں مذہبی رواداری اور ہمزیستی کی بنیاد مضبوط بنا دی، اگر کسی نے کشمیریوں کو خود اعتمادی کا سبق دیا اور اگر کسی نے جموں کے اور لداخ کے لوگوں کی شخصیت اور شناخت کو فروغ دیا تو وہ بخشی غلام محمد تھا۔ بخشی صاحب

کشمیر کا تنہا لیڈر تھا جسکو عوام کا لیڈر مانا جانا چاہیے۔

بارہ سال کی عادلانہ اور منصفانہ حکومت کے بعد نہرو نے ایک انوکھی سازش کے تحت جس طرح بخشی غلام محمد کو اقتدار سے ہٹایا، وہ نہرو کی مذموم حرکت اور اسکی شخصیت کی پستی اور فرومایگی کی بدترین مثال ہے۔ تاریخ اسکو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اِسی مذموم، قبیح اور احمقانہ حرکت کا نتیجہ ہے کہ آج کشمیر ہندوستان کے ہاتھوں سے کھسک رہا ہے۔ آج بخشی غلام محمد کا خاندان کشمیر کی تباہی اور حزاب کاری کے منظر کو دیکھ کر اُس مرحوم وطن دوست کی روح کو فاتحہ بھیجتا ہوگا کہ آپ نے جو کچھ کہا تھا وہ یکے بعد دیگرے برباد ہوتا جارہا ہے۔

1974ء کے موسم خزان کے دن تھے۔ میں گاندربل کسی کام سے گیا تھا۔ بی ہامہ پہنچ کر میرے دِل میں خیال آیا کہ حضرتِ مولانا مسعودی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف ملاقات حاصل کروں۔ عمر اور علم اور تجربہ میں حضرت مولانا سے میلوں پیچھے ہونے کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتے تھے اور بہت پیار اور ایہماک سے ملتے تھے۔ خوش تھے کہ ایک برہمن زاد، مولانا روم اور شمس تبریز سے آشنا ہے۔ بہرحال اِن دنوں افواہ گرم تھی کی شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستانی زمامداروں سے افہام اور تفہیم کے مراحل طے کئے ہیں اور عنقریب ہی عفان حکومت سنبھالنے والا ہے۔ میں مولانا مسعودی کے ساتھ شاذ و نادر ہی سیاسی مضامین پر گُفت وشند کیا کرتا تھا۔ ہمارا نفس

کلام ادب اور شعر ہوا کرتا تھا۔ مجھے ہمیشہ خاقانی کے قصاید کے معنی سمجھانے کیلئے کہتے تھے بلکہ ایک بار مجھے کہا کہ ایران کا مجھے معلوم نہیں لیکن ہندوستان پاکستان میں کوئی بھی میری طرح خاقانی کو سمجھانے کی استعداد نہیں رکھتا۔ بہرحال اُن دنوں چونکہ شیخ کے دوبارہ اقتدار حکومت سنبھالنے کی بات چل پڑی تھی تو میں نے اسکا مذکرہ چھیڑا۔ بولے ہاں شیخ صاحب نے کسی کو میرے پاس یہ پیغام دیکر بھیجا تھا کہ ماضی کے واقعات کو فراموش کرکے واپس سیاسی دھارا میں آو اور پھر سے کشمیر کی تعمیر کا بیڑا اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ وہ پھر سے عنان حکومت سنبھال رہا ہے اور مجھے حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ مولانا نے بولا کہ میں نے قاصد کو یہ جواب کہنے کو کہا کہ شیخ صاحب خوشی کی بات ہے کہ آپ پھر حکومت سنبھالینگے۔ میری طرف سے مبارک باد پیش ہے۔ رہا سوال حکومت میں شامل ہونے کا تو میں آونگا اور حلف لینے سے پہلے آب کی ہمراہی میں بخشی غلام محمد کی آرامگاہ پر جاکر فاتحہ پڑھینگے اور اسکی روح سے التجا کرینگے کہ ہمیں معاف کرنا ہم وہی کرنے جارہے ہیں جو آپ نے کیا تھا۔"

مولانا مسعودی نے مجھے کہا کہ اسکے بعد شیخ سے میرا کبھی بھی ملنا نہ ہوا۔

بخشی غلام محمد کی معزولی کی بنیادی وجہ نہرو کی آمریت اور خودسری

ہے۔ نہرو نے دِکھایا کہ وہ جمہوری قدروں کو پاؤں تلے روندھنے میں عار نہیں کرتا اگر اسکی انا کو ٹھیس لگ جائے۔ بخشی غلام محمد کو اپنی فطری ذلالت اور آمرانہ استبداد کا نشانہ بنا کر نہرو نے کشمیر کی روح پر جو کاری زخم لگایا وہ اِسکے لئے تا قیامت طوق لعنت بنکر رہیے گا۔

1975ء میں نہایت غیر جمہوری اقدام کے ذریعے شیخ عبداللہ کو شیخ -اندرا ایکارڈ کے بعد پھر سے کشمیر کی مسند حکومت پیش کی گئی۔ شیخ نے اقتدار کی خاطر محاذ رائے شُماری کو الگ کر کے حکومت سنبھالی۔ اِتنی طویل مدت کیلئے حکومت سے دور رہکر اور پھر عمر رسیدہ ہو کر وہ آخری وقت میں کیا حکومت کرنے کے اہل تھا۔ سوچنے کی بات ہے۔ 1975ء سے لیکر زندگی کے آخری لمحوں تک شیخ عبداللہ نے ہند مخالف اداروں کو مرموز طور پر تقویت پہنچائی۔ وہ اسلامی ممالک اور مخصوص وسطی ایشیا اور سعودی عرب کی سیاست کی طرف راغب ہوا۔ ایک پورا جہاز چارٹر کرا کے اپنے پورے کنبہ کو عمرہ کرانے کی غرض سے سعودی عرب پہنچایا جہاں سعودی عرب اور پاکستان اور ترکی کے خفیہ سراغ رسانی کے عمایدین سے خفیہ ملاقاتیں کرتا رہا۔ پاکستان کے خلاف تقریریں کرنا بند کر دیں۔ پاکستان میں جنرل ضیاالحق نے ذوالفقار علی کو پھانسی پر لٹکایا تو سارے کشمیر میں جماعت اسلامیوں کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا۔ جماعتوں کے گھر جلائے گئے اور انہیں مردود کہا گیا۔ شیخ عبداللہ کچھ عرصے تک خاموش رہا لیکن بعد میں

پینترا بدل کر جماعتوں کے قریب آیا۔ رفتہ رفتہ سعودیوں اور وہابیوں کے ساتھ راہ و رسم مضبوط کی۔ کشمیر میں جماعیّتوں کے خلاف جو ہوا چلی تھی اسکا سد باب کیا اور جماعت اسلامی کو مدرسے کھولنے کیلئے حمایت دی گئی۔ گویا کشمیر میں اسلامی طرزِ زندگی کو وُسعت دینے کیلئے زمیں ہموار بنائی گئی۔

شیخ عبداللہ کا انتقال ہوا تو وزیرِاعظم اندرا گاندھی اور صدر جمہوریہ سنجیوا ریڈی دونوں تجہیز و تکفین کی رسومات ادا کرنے کی تقریبوں میں سری نگر آئے۔ لگ بھگ اٹھ دس لاکھ لوگوں کا ایک جم غفیر جنازہ کے پیچھے پیچھے اظہار عقیدت کرتے ہوئے نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ اِس سے بڑا ماتمی جلوس مصر کے کرنل ناصر جو صدر تھا کا ہی بتایا جاتا ہے۔ اتنے بڑے ہجوم کو دیکھ کر حکومت ہند نے بلا تاخیر شیخ عبداللہ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ریاست جموں و کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ کی باگ ڈور سُپرد کی۔ چنانچہ خاندانی حکومت کی بنیاد کا یہ آغاز تھا۔ اور خاندانی حکومت کو بعد میں کشمیری مخالفین نے حکومت خلاف بغاوت کا بہانہ بنایا۔

## مسلح بغاوت

کشمیر میں مسلح بغاوت کا منصوبہ پاکستان کے صدر جرنیل ضیا نے Topac کے نام سے بنایا تھا۔ اسکا بُنیادی اصول یہ تھا کہ جنگ کشمیر اور ہندوستان کی سرزمین پر چھیڑی جائے۔ کشمیری نوجوانوں کو اسلحہ کی تربیت

کیلئے مقبوضہ کشمیر میں دائر کئے گئے تربیتی کیمپوں میں بھیجا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں کشمیری نوجوان مسلمان سوپور، کپوراور اپور یعنی سوپور۔ کپوراره اور اُس پار کا نعرہ دیتے ہوئے کپوارہ کے راستے پہاڑوں سے گذر کر مظفر آباد اور مقبوضہ کشمیر کے تربیتی کیمپوں میں پہنچے۔ پہلے تو اِنکی brain washing ہوتی تھی اور ہندوستان اور ہندو مخالف زہر ان کی ذہن میں بھرا جاتا تھا اور پھر پاکستان کی فوج کے ریٹائیر شُدہ افسران ان کو اسلحہ بارود اور دہشت گردی کی ٹریننگ دو تین مہینہ یا زیادہ وقت کیلئے دیتے اور وہ اسلحہ لے کر چوری چھپے واپس وادیٔ میں داخل ہو کر وادیٔ میں قتل و غارت کا بازار گرم کرتے رہے۔ کشمیر لبریشن فرنٹ کی قیادت میں کشمیری بندوق برداروں نے وادیٔ واپس آ کر نہتے اور بے گناہ کشمیری پنڈتوں کو گولیوں کا شکار بنایا۔ انہیں گھروں میں، دفتروں میں، سڑکوں پر، دوکانوں پر دن میں رات میں چن چن کر ہلاک کِیا گیا۔ قاتل وہ کشمیری جوان تھے جو پار سے ٹریننگ اور ہتھیار لے کر آئے تھے۔ 1990ء کے پہلے دو تین مہینوں میں جبکہ ریاستی حکومت بکھر چکی تھی اور ریاست میں افراتفری مچی ہوئی تھی کشمیری پنڈت اقلیت کے افراد کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اُتار گیا یہاں تک بیگناہ مقتولین کی تعداد بارہ سو تک پہنچ گئی۔

جگ موہن کو منت سماجت کے بعد جب بار دیگر گورنر بنا کر بھیجا گیا تو نیشنل کانفرنس اور کانگرس کی ملی جلی سرکار نے استعفیٰ دیا۔ فاروق

عبداللہ جو کہ ملی جلی سرکار کا وزیر اعلیٰ تھا، لندن اپنے عیال سے جا ملا اور عیش وعشرت میں گولف کھیلتا رہا اور ناؤ ونوش کی مجلسوں کا لطف اُٹھاتا رہا۔ اسکی ضمیر نے ذراء بھی کوسا نہیں کہ جن لوگوں کی نمایندگی کر رہا تھا اُنکی تحفظ، ان کے مال و جان اور آبرو کی تحفظ کیلئے میدانِ جنگ میں ڈٹ جاتا۔ بزدِلوں بے غیرتوں کی طرح لندن میں جا کر نقاب پوش ہوا۔ اسکے ساتھ اسکی کابینہ کے باقی منسٹر چاہے نیشنل کانفرنس کے تھے یا کانگریس کے، سری نگر سے دُم دبا کر جموں فرار کر گئے۔ جموں میں انہوں نے سرکاری بنگلوں پر غیر قانونی قبضہ کیا اور آرام سے بغیر کرایہ ان عظیم الشان عمارات میں قیام پذیر ہوئے۔ پولیس کو حکم دیا کہ انہیں سیکورٹی فراہم کرے۔ جموں میں جتنے بھی انتظامیہ کے اہلکار تھے بیشتر کشمیری یا بھدرواہی مسلمان تھے انہوں نے اِن مفرور سابقہ منسٹروں کی بھرپور حمایت کی اور انہیں سیکورٹی وغیرہ فراہم کی۔ کچھ دن گذرنے کے بعد اِن سابقہ وزیروں اور کشمیری ممبران اسمبلی نے خفیہ طور پر دہشت گردوں کی قیادت کے ساتھ رابطہ برقرا کیا اور اسطرح کشمیر میں مسلح بغاوت کو کامیاب بنانے کے چھوٹے بڑے منصوبے روزمرہ کا معمول بنے جنہیں اِن کی وزیروں کی کوٹھیوں میں بنایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ حکومت کی مشینری میں پولیس اور انتظامیہ میں باغیوں کا اثر رسوخ بڑھا اور سول نافرمانی کی سی صورت پیدا ہوئی۔ سکریٹری اور کمیشنر کی سطح کے بوروکریٹ نے ایک دستاویز مرتب کر لی اور اس پر اپنے دسخط مثبت کئے۔

دستاویز میں باغیوں کی حمایت میں ایسے بجھاو دیئے گئے جو بادی النظر میں عسکریوں کی بتائی ہوئی لگتی تھیں۔ سیاسی جماعتیں، نیشنل کانفرنس وغیرہ مسلح باغیوں کی بولی بولنے لگے۔

19/جنوری 1990ء کی آدھی رات کو سارا شہر سری نگر سڑکوں، چوراہوں کھلی جگہوں اور پارکوں میں بھر آیا۔ لا اللہ اور پاکستان زندہ باد کے نعرے آسمان کو چھونے لگے۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ پولیس دم دبا کر بارکوں میں جا گھسی۔ ایک بھی فوجی کہیں سڑک پر دکھائی نہیں دیا۔ سردی کڑاکے کی تھی۔ لوگوں نے سڑکوں چوراہوں اور کھلی جگہوں پر قالین بچھا دیں فرش لگا دئے۔ حقہ چالو ہوا۔ سماوار اور چائے نمکین اور باقر خانیوں کا دور چلا۔ لوگ جوق در جوق ایک دوسرے سے گلے لگتے اور پاکستان بننے پر مُبارک باد کا تبادلہ کرتے۔ لوگوں نے اپنے بازووں پر سبز بلے باندھے، اسلامی نعروں سے پورا شہر گونج اُٹھا۔ الاو جلائے گئے اور لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی اپنی گھڑیوں کا وقت بدل کر پاکستانی وقت سے مطابقت کریں۔

پنڈتوں نے یہ شور اور غوغا سنا اور یہ خطرناک نعرے سننے تو سہم گئے سہمے ہوئے پرندوں کی طرح اپنے اپنے گھونسلوں اور گھروں کے کونوں میں سمٹ کر رہ گئے۔ گھر کے سب اہل خانہ زن و مرد، جوان و بوڑھے ایک ہی کمرہ میں بخوابنا کر بیٹھے اور نیند کا نام ونشان نہیں۔ کوئی تحفظ نہیں کوئی بچاو کا راستہ نہیں۔ حکومت پاش پاش ہو چکی تھی۔ سیاسی لیڈر دہشت گردوں

کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ بن چکے تھے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ ایک دوسرے سے حیرت اور یاس کی حالت میں تفحص اور تجسس کر رہے تھے کہ اب ان کا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ زندگی کا خطرہ تو تھا ہی پر عصمت اور عزت پر حملہ ہوسکتا تھا۔ اتنی چھوٹی سی قوم کس طرح اپنے تحفظ کا اہتمام کرے اور کس طرح اپنی آبرو بچانے کی تدبیر سوچے جبکہ چاروں اور خوف و ہراس، سراسیمگی اور بے سروسامانی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ فکر سلیم مفلوج ہوچکی تھی۔ اِنسانی قدروں کا قتل ہو رہا تھا اور ان کی پانچ ہزار سال کی تاریخ تمدن فنا کے گرداب میں پھنس چکی تھی۔ پیرانہ سر بزرگ جو اپنے اپنے گھروں سے کبھی نہ نکلے تھے اب اپنی گھروں کو موت اور تباہی کی علامت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آناً فاناً انہیں اور سارے پنڈتوں کو اپنے مکانوں سے محلوں سے کشمیر سے اور حتیٰ اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ وہ اِن سبھی سے دور کوسوں دور سینکڑوں میل دور بھاگنا چاہتے تھے۔ بقول غالبؔ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ اور ہم زبان کوئی نہ ہو
بے درد و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسبان کوئی نہ ہو

کشمیری پنڈتوں کے انخلا نے ہندوستان کی کھوکھلی سیکولرازم کا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دِیا۔ اب ہندی حکمران اور بخصوص کانگریسی نیتا کس منہ

سے بول سکتے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کے سیکولرازم کا تاج ہے۔

لگ بھگ ساڑھے تین لاکھ کشمیری پنڈت اپنی اپنی ذاد گاہیں، اپنے مکان، منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد، باغات، اراضی، دُکانیں، کاروبار، گرہستی اور نوکریاں چھوڑ کر جان ناتوان ہتھیلی پر لئے جلاوطنی کی حالت میں کشمیر سے نکل کر جموں، دہلی اور دیگر شہروں کی طرف روانہ ہوئے۔ کہاں جا رہے تھے، کہاں رات کا بسیرا ہوگا، کہاں دِن گذریگا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ افراتفری اور بے سروسامانی کا عالم۔ 1947ء کے تقسیم ہند کی داستان کا اعادہ ہوا۔

پنڈتوں کے 1990ء کے جنوری مہینہ میں رونما ہونے والے انحلا کی داستان کچھ دِلچسپ پہلو بھی ہیں۔ پہلا نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ جب پنڈت بسوں، ٹرکوں اور موٹروں میں بیٹھ کر سری نگر سے نکلے تو راستے میں کوئی ان کے مانع نہ ہوا۔ کوئی ایک واقعہ بھی نہیں ہوا جس میں کسی بھی مفرور پنڈت شخص یا خاندان کو فرار ہونے سے باز رکھا گیا ہو یا سرِ راہ لوٹنے کی کوشش کی گئی ہو حالانکہ اُس مخمصے میں ایسا ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی کسی بھی فراری خاندان کا مال و جائیداد دوران سفر لوٹا نہیں گیا۔ اور نہ ہی راستے میں کوئی مزاحمت ہوئی۔

ہم یہاں تک بھی کہہ سکتے ہیں کہ اصل میں عسکریوں کا اصلی پروگرام یہ نہیں تھا کہ اہل ہندو کو کشمیر سے نکالا جائے۔ خوف و ہراس

پھیلانے کی بات مانی جاسکتی ہے۔ ہوا یہ کہ جب بے بند بندوق ان کے ہاتھ لگی تو انہیں اپنی طاقت کا احساس ہونے لگا اور اِس احساس کے تحت بندوق برداروں نے مظاہرہ کرنا لازمی سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سارے عمل میں بیچارہ پنڈت شکار بن کر رہ گیا۔

کچھ وقت گذرنے کے بعد جب کشمیر میں اکثریتی فرقہ کو پتہ چلا کہ اب پنڈت اتنی جلدی واپس آنے سے رہا تو انہوں نے بلکہ ہمسایوں نے انکی پسماندہ جائیداد پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ مکانوں کو لوٹا گیا۔ جائیداد منقولہ کو غصب کیا گیا۔ دُکانوں پر قبضہ کیا گیا اور مکانوں کو نذر آتش کیا گیا۔ اقلیتی فرقہ کی جائیداد پر غاصبانہ قبضہ ہوا اور آثار بتانے لگے کہ کشمیری پنڈتوں کی واپسی کا مسئلہ کشمیر کی اکثریتی فرقہ کیلئے ہمیشہ کیلئے بند ہو چُکا ہے۔

کشمیر سے باہر مہاجر پنڈتوں نے پہلے تو ایک ہی تنظیم بنام پنُن کشمیر بنائی اور ہوم لینڈ کا مطالبہ پیش کیا۔ دو تین سال تو ہ تنظیم زور و شور سے کام کرتی رہی۔ غالباً ہندوستانی سراغ رسان محکمہ کے بعض غیر سرکاری حلقوں میں پنُن کشمیر کی الگ وطن کی مانگ کی در پردہ حمایت ہوتی رہی ہو گی۔ لیکن جب صاحبان اقتدار کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ یہ تنظیم مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور ہندو کاز اہمیت اور مقبولیت حاصل کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے تو پنُن کشمیر کو توڑ دیا گیا۔ چونکہ پنُن کشمیر کی نوجوان

قیادت کو سیاسی شعبدہ بازی اور پینترے بازی کا چندان تجربہ نہ تھا اور ego کے مارے ہوئے تھے، وہ تنظیم کے بکھرنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے عمل کی روک تھام کرنے میں قاصر رہے۔ اور خلاصہ میں اسکے تین بڑے حصے ہو گئے۔ اس وقت تینوں حصے مفلوج اور ازکار افتادہ ہیں۔ کشمیری پنڈت مہاجرین کی آپسی نا اتفاقی اور ایک دوسرے کے ساتھ رقابت اور پھر سیاسی چالبازی سے نا آشنائی نے مہاجر قوم کے وقار اور زور کو ختم کر دیا۔ کشمیری پنڈتوں کی تقدیر کا فیصلہ اُن لوگوں کے ہاتھوں چلا گیا جنکو نہ تو کشمیر کی تاریخ کا کچھ علم ہے اور نہ کشمیری کلچر اور طرزِ زندگی کا کچھ پتہ ہے۔ یعنی زندہ بدست مردہ والی بات ہے۔

ہجرت سے لیکر آج تک 28 برس گذر چکے ہیں۔ طویل وقفہ ہے اور جس کسی سے ملو چاہے وہ سرکاری حلقہ سے تعلق رکھتا ہو یا نجی حلقہ سے یہی کہتا ہے کہ کشمیری پنڈت کشمیر کی ثقافت اور کشمیر کے ورثے کا جزء لاینفک ہے۔ پنڈتوں کے بغیر کشمیر نامکمل ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بہتان اور یاوہ سرائی ہے۔ جو بھی اِس طرح کی بات کہتا ہے وہ ایک نہیں دو زبانیں رکھتا ہے۔ سرکاری حلقوں میں چاہیے مرکزی سرکار ہو یا ریاستی سرکار نہ تو کوئی حکمران صدق دلی سے چاہتا ہے کہ پنڈت واپس کشمیر آئے اور نہ ان کے پاس اِن لوگوں کی واپسی کا کوئی مستند اور قابل قبول منصوبہ ہے۔ ہاں اشک شوئی ہے اور کچھ نہیں۔ اگر واقعی طور یہ سوچتے کہ پنڈتوں کا کشمیر

سے انخلا ہندوستانی سیکولرازم اور جمہوریت پر شدید اور ناقابل تلافی حملہ ہے تو اُسکے انسداد کی طرف ضرور کوئی قدم اُٹھایا جاتا۔ ایسا نہ ہوا اور نہ ہونے کی کوئی اُمید ہے۔

## ہماری واپسی

سیاسی حلقوں کی توجہ پنڈت کاز کی طرف مبذول کرنے کے مقصد کیلئے یہ نعرہ دُرست ہے کہ ہم لوگ واپس کشمیر جائینگے اور کشمیر کو ہندوستان کا حصہ بنانے میں اپنا رول ادا کرئینگے۔ لیکن حقیقت اور تصور میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ستائیس برس کی مدت طویل مدت ہوتی ہے۔ اس مدت کے دوران جو حالات درپیش آئے ان کا تجزیہ صحیح طور کیا جائے تو کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ایک پوری نسل جو ستائیس برس کی ہو چکی ہے کشمیر سے باہر پیدا ہوئی اور کشمیر سے باہر ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی ماحول میں پنپ چکی ہے۔ وہ کشمیر کی تاریخ، تمدن، اور طرزِ معاشرت سے قطعاً بیگانہ ہے۔ ان کو کشمیر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اسلئے انہیں واپس کشمیر جانے کیلئے کہنا غیر منطقی اور غیر منصفانہ بات ہے۔

ہماری قوم اہلِ قلم والی قوم ہے۔ قلم کے علاوہ اِن میں شاذ و نادر ہی کوئی ہنر ہے۔ تجارت کے اہل نہیں، دستکاریوں کے اہل نہیں، یومیانہ

مزدوری کے قابل نہیں، ہاں جس نے کوئی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کی تو وہ کسی صنعت سے منسلک ہوا ورنہ بس کلرکی یا سکول ٹیچر۔ اب تو ہم میں کوئی بھی سکول ٹیچر بننا نہیں چاہتا۔ یہ پیشہ بھی ہم سے چھین لیا گیا۔ کشمیر واپس جا کر ہماری پود کیا کرے گی۔ ذریعہ معاش کیا ہو گا۔ سماجی تحفظ کون دیگا۔ نوکریاں تو اب مسلمانوں کو بھی نہیں ملتی ہیں ہماری بات نہیں۔ جہاں ذریعہ معاش میسر نہ ہو وہاں چاہیے جنت کی ہوا اور کوثر کا پانی ہی کیوں نہ ہو تو ایسی جنت کا کوئی کیا کرے؟

تیسری بات اور اہم بات یہ ہے کہ ایک اقلیت تب تک سُکھ اور چین سے نہیں رہ سکتی جب تک نہ اُسے اکثریت کی خوشنودی حاصل ہو۔ کشمیر میں خوشنودی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے۔ وہاں کی اکثریت ہم پر مندرجہ ذیل الزامات عاید کرتی ہے:

۱۔ آپ نے ڈوگرہ دور میں تمام سرکاری ملازمتوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔

۲۔ آپ کشمیر میں ہندوستان کے جاسوس اور سراغرسان بن کر بیٹھے تھے۔

۳۔ آپ نے آزادی کے بعد بھی بہت ساری اہم پوسٹیوں پر قبضہ جمائے رکھا تھا۔

۴۔ آپ RSS کے ایجنٹ ہیں اور کشمیر پر مسلمانوں کو اقلیت میں بدلنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔

۵۔ آپ آج بھی مسلمان غریبوں سے اپنی زمین کاشت کرواتے تھے اور

خود آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اب اِن تہمتوں کا جواب کیا دیا جائے۔ ہم کشمیر میں تب ہی چین اور سُکھ سے زندگی بسر کر سکتے ہیں جب اِن الزامات کو بے بنیاد ثابت کِیا جائے وہ فرصت اور وہ وقت کس کے پاس ہے،

حقیقت امر یہ ہے کہ ہماری نئی پود نے آزادی اور خود اختیاری کی ہوا کھائی ہے۔ انہوں نے اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنی زندگی سنواری ہے۔ کم و بیش پر گذارہ کیا ہے۔ چھوٹی بڑی رہایش گاہیں بھی بنا چُکے ہیں۔ سینکڑوں نوجوان، تعلیم یافتہ کشمیری پنڈت ہندوستان چھوڑ کر امریکہ، اسٹریلیا اور دنیا کے دیگر ملکوں میں کسب معاش کیلئے چلے گئے ہیں۔ اب ان میں وسعت نظر آئی ہے اور انکی ہمت اور ان کا حوصلہ بڑھ چُکا ہے۔ اسلئے انہیں ترقی اور پیش رفتگی کی راہوں سے واپس کشمیر کی نامساعد نامعقول اور افلاس بھری تاریکیوں میں پھر سے دھکیل دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔

صدیوں تک ہماری قوم غیر متحرک immoble رہی۔ حبہ کدل سے اُٹھ کر زینہ کدل میں سکونت کرنا ایک المیہ مانا جاتا تھا چہ جائیکہ جموں یا کسی اور شہر میں چلا جائے۔ وہ منحوس اور مردود روایت ہم نے توڑ دی۔ ہم نے کھلی ہوا میں پرواز کیلئے پر کھول دیئے، ہماری زنجیریں ٹوٹ چُکی ہیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ڈالی ہوئی ہتھکڑیاں چور چور ہو چُکی ہیں۔ ہم نے اپنی تاریخ کے گذشتہ سات سو سال کے صفحات کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اب ہم

ایک آزاد، زندہ دِل، متمدن اور ماڈرن قوم کے عنوان سے زندگی بسر کرئینگے۔ ہم تاریخ کا ایک نیا اور درخشان باب کھول دینگے اگلے بیس برسوں میں ہماری آبادی کا نصف سے زیادہ امریکہ میں بس چُکا ہو گا کیونکہ ہم تعلیم اور ہنر کے زیور سے آراستہ ہونگے اسلئے میرے دوستو اور میری قوم کے عزیزو یاد رکھو۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
زمین اور ہیں آسمان اور بھی ہیں

14/3/2016 ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈت



# حرفِ آغاز

تین سال پہلے یعنی فروری 2013ء میں ''کشمیری پنڈت بجھتے چراغ'' کے عنوان سے میری کِتاب چھپی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ جلائے وطن کئے گئے پنڈتوں کی قوم کے مشکلات، مصائب، وطن واپسی اور بازآبادکاری جیسے مسایل کی نشاندہی کی جائے۔ اِس بات کی بھی ضرورت تھی کہ اُنکی قربانیوں، سرکاری طور پر اِن کے ساتھ دانستہ بے انصافی اور ان کے شہیدوں کوفراموش نہ ہونے دِیا جائے۔

کِتاب چھپ کرعوام تک پہنچی۔ سرکاری حلقوں تک بھی اِسکو پہنچایا گیا لیکن کوئی قابل توجہ نتیجہ نہ نکلا۔ اِس اقلیتی فرقہ پرڈھائے گئے مصائب کا ازالہ نہ ہوا اور انہیں کس مپرسی کے ماحول سے باہر نکالتے کی کوئی صورت نظر میں نہیں آئی۔

گذشتہ تین برسوں میں اِس قوم کی مشکلات اورمحرومیوں میں اور

بھی اضافہ ہُوا۔ ایک بے دست و پا قوم کے ساتھ غیر اِنسانی سلوک کرنے کی کئی اور باتیں سامنے آ چُکی ہیں۔ اسلئے گونا گون مصروفیات کے باوجود میں نے زیرِ نظر موضوع پر کئی اور باتوں کا اضافہ کِیا اور اِس طرح ایک جامع تاریخی دستاویز قارئین گرامی کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مقصد یہی ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہماری خونچکان داستان کہیں پردۂ نسیان میں کھو نہ جائے۔

افسوس اِس بات کا ہے کہ کشمیری پنڈت اہنسا پرمو دھرما یعنی عدم تشدد پر یقین کامل رکھنے والا، امن پسند اور انسانی بھائی چارہ کے فلسفہ کا علم بردار کِس جرم کی پاداش اٹھا رہا ہے۔ نہتے اور معصوم پنڈتوں کے قاتل بلا روک ٹوک برسرِ عام آزاد اور بے خوف گھوم رہے ہیں۔ ان پر انسانی قتل کا مقدمہ چلانا تو درکنار انہیں ایک دن بھی حراست اور پوچھ تاچھ کیلئے دھرا نہیں لِیا گیا۔

ہماری جمہوریت بدقسمتی سے ووٹ بنک تک محدود ہو کر رہ چُکی ہے۔ سیاست اعلیٰ قدروں سے کافی دور نکل چُکی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسلوب جمہوریت کی ترقی نہیں بلکہ اسکے تنزل کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ اقلیتی فرقہ کے تحفظ اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتا ہے۔ جمہوریت میں رخنہ پڑے تو لاقانونیت کا دور دورہ ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ چنانچہ اِسی طرح کے علامات نظر آ رہے ہیں۔

میں اپنی قوم کی اجباری ہجرت کا چشم دیدہ گواہ ہوں۔ سارے واقعات یکے بعد دیگرے میری آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے۔ اسلئے مجھے کسی مورخ کی نگارش یا سند کی ضرورت نہیں نہ ان کا حوالہ دینا لازمی ہے کیونکہ عیاں راچہ بیان۔ پچھلے پچاس برس کی کشمیر کی تاریخ کے اوراق میری نگاہ کے سامنے سیاہ ہوتے رہے۔ میں نے کشمیر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو اپنی آنکھوں سے بنتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ سیاست کی نیرنگیاں، حکمرانوں کی سیاہ کاریاں، عوام کو ڈوبتی اُمنگیں اور پاش پاش ہوتے ارمان یہ سب کچھ میں نے بہ نفس نفیس زیرِ مشاہدہ لایا ہے۔ کتنی حکومتیں بدلیں اور کتنے وزرائے اعلیٰ مسند اِقتدار پر جلوہ افروز ہوکر طاقِ نسیان کی رونق بن کر چلے گئے۔ اس تمام مخمصہ کے دوران کشمیری پنڈت کے نصیب میں نہ انصاف تھا اور نہ سکون۔ انہیں قوم کی مرکزی رو میں داخل ہوکر ایک عام شہری کے حقوق اور آزادی سے بہرہ ور ہونے نہیں دیا گیا۔ کبھی اُسے ہندوستانی جاسوس اور کبھی وطن دُشمن بتایا گیا۔ بار بار ایک جُرم کا اعادہ کِیا گیا کہ وہ ڈوگرہ حکومت کے ایام میں ریاست کے سیاہ وسفید کا مالِک بنا تھا اور اکثریت کے حقوق کا غارتگر بنا ہُوا تھا۔ اِن الزامات کی نہ تو کوئی بُنیاد تھی اور نہ ہی کوئی قابل باور ثبوت تھا۔ لیکن مذہبی اقلیت کے خلاف نفرت پھیلانے کا مؤثر حربہ تھا۔

وادیٔ کشمیر میں امن واماں اور سیکورٹی حالات اِس حد تک بگڑ گئے

کہ ہندو مسلم بھائی چارے اور انسانی رشتوں کی بات کو فرسودہ خیالی سے تعبیر کِیا جانے لگا۔ سوچ اور انداز فکر میں مکمل بدلاؤ آیا یہاں تک کہ مذہبی جنون زدگی نے غیر مسلموں کے ساتھ نفرت کرنا اِن کٹر پنتھوں کا شیوہ بن گیا۔ کشمیری پنڈت بحیثیت اِنسان اور بحیثیت کشمیری وادی کے مسلمان کیلئے ناقابلِ برداشت اکائی بنکر رہ گیا۔

میری اپنے ہم وطن برادران سے گذارش ہے کہ ہندوستان دُنیا کی ایک بہت بڑی جمہوریت ہے۔ کشمیر اِس عظیم جمہوریت کا ایک حصہ ہے۔ کشمیری لوگ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر کے باہمی رواداری اور اِنسان دوستی کی گرانقدر دولت کو مالا مال بنا سکتے ہیں۔ وہ مثبت اور تعمیری شہریوں کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ میں نے اِسی جذبہ کو لے کر اِس کِتاب ''داستانِ دار و رسن'' کو ضبط تحریر میں لانے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ صاحبِ نظر قارئین سے میری استدعا ہے کہ اس نگارش کو تاریخی حقایق کے پس منظر میں ملاحظ کریں۔ تجزیہ اور تشریح میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن واقعات کو مسخ کر کے پیش کرنا علم و ہنر کو شرمندہ کرنے کے برابر ہے۔

پیارے لال کول بڈگامی



# حصّہ اوّل

# جہاد کی پیش قدمی

1947ء اور 1965ء کی جنگوں کے بعد پاکستان اِس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ کشمیر کو بزور بازو ہتھیانا اِسکے لئے ممکن نہیں۔ اسلئے اُس نے کچھ نئی ترکیبوں کو حصول مقصد کیلئے زیرِ غور لانا شروع کیا۔ ایک ایسی حکمت عملی کی ضرورت تھی جو آمنے سامنے کی جنگ سے ہٹ کر کوئی اور طریقہ کار اختیار کرے۔ چنانچہ پاکستانی قیادت اور جنگ بازوں نے دُنیا کے مختلف ملکوں میں حریت کے نام پر دہشت گردی کی تنظیموں، اُنکے نظام، اُنکی عملداری اور دیگر متفرقات پر غور کر کے اِسے کشمیر کے تناظر میں روبعمل لانے کی ترکیب سوچی۔ یہیں سے غیر رسمی جنگ بازی اور مسلحہ بغاوت کا تانا بانا بُننے کا آغاز ہوا۔ اِسکو انگریزی زبان میں ''پراکسی وار'' یعنی بلاواسطہ جنگ کا نام دِیا گیا ہے۔ اِسطرح کی لڑائی کی حکمت عملی یہ ہے کہ آمادہ پیکار نوجوانوں کو دہشت گردی کی تربیت دیکر انہیں ہتھیاروں سے لیس کیا

جائے۔ ساتھ ساتھ انہیں مذہبی مدرسوں درسگاہوں میں دوسرے مذاہب کے خلاف نفرت اور بغض کی تعلیم ٹھوس دی جائے تا کہ وہ جسمانی اور ذہنی دونوں طرح مبارزہ اور پیکار کیلئے آمادہ ہوں۔ اور دہشت گردی کے ہر مُمکنہ ہتھکنڈے کو کام میں لاسکیں۔ چنانچہ اِس طرح کی مسلحانہ دہشت گردی اور حکومت مخالف جنبش جنوبی امریکہ، شمالی افریقا اور مشرق بعید کے کئی ملکوں میں رونما ہوئی تھی جسکا پورا مطالعہ پاکستانی خفیہ ایجنسی ISI نے بڑی گہرائی سے کِیا۔

پاکستانی تخریب کاروں نے اِس طرح کی تخریب کاری کا آغاز 1984ء میں کِیا۔ اِسکی پہلی کڑی یہ تھی کہ شبیر شاہ کی پیپلز لیگ کو بُنیادی اور عقبی قوت کے طور استعمال کِیا جائے۔ پاکستان کا منصوبہ یہ تھا کہ جس طرح افغانستان میں جہادی علمداری کے تحت سویت یونین کی دراندازی کی مقاومت کامیابی سے کی گئی تھی اِس طرح کشمیر میں بھی ہندوستان کے خلاف مسلح مگر بلاواسطہ جنگ کے طیفل آزادی کے حصول کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ بے شک جہاد کی ترکیب کامیاب ہوئی اور سویت روس کو افغانستان سے نکلنا پڑا۔ لیکن یہاں بتانا ہوگا کہ پاکستانی تخریب کار ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھے اور وہ یہ کہ پچاس سال کے جمہوری تجربہ کے نتیجہ میں ہندوستان نے کشمیریوں کو سیاسی استقامت اور اقتصادی پیش رفت کے بے شمار مواقع فراہم کئے تھے جِنکی بنا پر کشمیری معاشرہ صحت مند طریقہ سے

بدل رہا تھا درصورتکہ افغانستان میں اِس طرح کی صورت حال نہیں تھی۔
ایک اور بات یہاں ضرور زیرِ نظر لائی جائیگی اور وہ یہ کہ بے شک بیکار اور بے روزگار کشمیری نوجوانوں نے مسلح بغاوت کو خوش آمد کہی لیکن افسوس کہ وہ اِس امر سے بالکل بے خبر تھے کہ نوجوانوں کے بڑے گروہ کو مسلح کرنا اور ضرب وحرب کی تربیت دینا ایک وقت میں کتنا خطرناک اور مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آج جو کشمیری قایدین ہزاروں لاکھوں کشمیری نوجوانوں کی بے وقت موت کی نوحہ خوانی کرتے ہیں وہ اِسی بے بند و بار اسلحہ برداری اور بہیمانہ دہشت گردی کا نتیجہ ہے۔ دہشت گردی اور خون ریزی نے اِن لوگوں کو اِتنا درندہ بنایا کہ وہ اپنے ماں، باپ، بھائی، بہن اور قریبی رشتہ داروں تک کی جان لینے پر آمادہ ہوئے ہمسایہ اور دوست احباب کی بات ہی نہیں۔

اُدھر پاکستان اِس درندگی پر انہیں شاباشیں دیتا رہا۔ اِنکی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور انہیں معصوم اور بے گناہ غیر مسلموں کو تہ تیغ کرنے کی تشویق دیتا رہا۔ اسطرح یہ قوم دیکھتے دیکھتے اِنسانی قدریں چھوڑ کر درندگی اور حیوانیت کا علمبردار بن گئی اور وہ بھی اُس مذہب کے نام پر جِسکو علما کے مطابق امن اور آشتی کا مذہب گردانا جاتا ہے۔ اس ساری واقعہ گیری میں اسلام کلیدی لفظ کے طور استعمال کِیا گیا تاکہ سادہ لوح لوگوں کو اُکسا کر دہشت گردی کا بازار گرم رکھا جائے۔

پاکستانی خفیہ ایجنسی نے پہلے ہاشم قریشی کو کشمیر لبریشن فرنٹ کی سربراہی کیلیئے منتخب کِیا جو اُن دنوں ہالینڈ میں جلاوطنی کے دن بسر کر رہا تھا اور جہاں اسکو پناہ مل چکی تھی لیکن وہ آزاد کشمیر پاکستان اور لندن میں کشمیر کی آزادی کا نعرہ بلند کرنے والوں کا ہم نوا تھا۔ کشمیر لبریشن فرنٹ میں ISI نے امان اللہ خان، افضل طاہر اور دیگر کئی لوگوں کو شامِل کِیا تھا جو لندن اور میر پور میں مقیم تھے۔ ہاشم قریشی نے پہلے تو کشمیر لبریشن فرنٹ کی سربراہی قبول کی اور ظاہر ہے کہ اُسکا معاوضہ دینے کا وعدہ بھی اِسکو دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہاشم قریشی کا قول ہے کہ جب ISI نے اُس پر یہ راز افشا کِیا کہ ISI چاہتا ہے مسلح کشمیری جہادی نہ صرف کشمیر کے ہندوؤں کو بلکہ ایسے مسلمانوں کی ہلاکت بھی عمل میں لائے جو کِسی نہ کِسی طرح کشمیر میں ہندوستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ ہاشم قریشی اپنی نگارشات میں رقم کرتا ہے کہ جب مجھے کہا گیا کہ کشمیر لبریشن فرنٹ کو ہدایت دی گئی ہے کہ کشمیریوں کا خون کشمیریوں کے ہاتھوں بہایا جائے تو میری کشمیری اور وطنی رگ پھڑک اُٹھی اور میں نے یہ منصوبہ آگے چلانے سے صاف اِنکار کِیا۔ اسکے بعد ISI نے اماں اللہ خان کو دامِ تذویر میں پھنسایا۔ اِسکے بعد کشمیر لبریشن فرنٹ کی داستان امان اللہ خان کی داستاں ہے۔

فروری 1988ء تک ISI نے کشمیر میں دہشت گردی کے سرغنوں کی خفیہ جماعت کو پورے لاؤ ولشکر کے ساتھ تیار کِیا تھا۔ اِن کے سرغنوں میں

دو تین نام زیادہ تر جانے گئے یعنی اشفاق حمید وانی، یاسین ملک، حمید شیخ اور جاوید میر۔ 1988-89ء میں JKLF اور جانباز فورس کو پوری طرح خونریزی اور غارتگری کے کام پر لگایا گیا۔ اِسی تنظیم کو صوبہ جموں میں بھی دہشت گردی کی سرگرمیوں کا آغاز اور فروغ دینے کے منصوبہ کو عمل میں لانے کا حکم دِیا گیا۔ برگیڈیر فاروق پاکستان فوج کا ایک افسر تھا۔ وہ اصل میں جموں سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ اِسکو ISI کی ہدایات کے مطابق جموں صوبہ میں بغاوت کی مرکزی قیادت سُپرد کی گئی۔ جموں میں اس تنظیم کا نام ''اَل مدد الخار علی Al Madad Algar Ali'' تھا۔

ہم ذرا پیچھے کی طرف جا کر 1987ء کے انتخابات پر سرسری نظر ڈالیں۔ 1987ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات عمل میں لائے گئے۔ اِن میں فاروق عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس نے بڑی دھاندھلیاں کیں۔ اِن کی وجہ سے عوام میں غصہ کی لہر دوڑی۔ کئی تنظیموں نے احتجاج بھی کِیا۔ لوگ کہنے لگے چونکہ مرکزی حکومت انتخابی شکایتوں کا ازالہ کرنے میں قاصر رہی ہے اسلئے یہ گمان کرنا کہ وہ اِن دھاندلیوں کی پشت پناہی کر رہی ہے کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔ مرکزی حکومت نے عوام کے ایک بڑے طبقہ کی اِس طرح کی سوچ کو جھٹلانے اور مسترد کرنے کی خاطر کوئی موثر قدم نہیں اُٹھایا۔ نیشنل کانفرنس کے غنڈوں نے مسلم یونائیٹیڈ فرنٹ (یعنی مف) کے کارکنوں پر دست اندازی کی۔ انہیں مارا پیٹا اور اپنی راہ سے ہٹانا چاہا۔ نیشنل کانفرنس

کانفرنس کی بالا دستی اور زور گوئی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مخالف جماعتوں نے باہمی اتفاق عمل میں لاکر مسلح جدو جہد کا طریقہ اپنانے کا تہیہ کیا۔

اُدھر پاکستانی خفیہ ایجنسی چاک و چوبند تھی اور اُس نے وادی میں اپنا جال پھیلا کر اور جماعت اسلامی کے فعال کارکنوں سے اشتراک کے بعد کشمیر وادی میں کشمیری مُسلم نوجوانوں کے ذریعے مسلح بغاوت کا آغاز کرنے کا خاکہ کھینچا۔ مف MUF کو ISI نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

یہی وہ وقت تھا جب کشمیری مُسلم نوجوان ہزاروں کی تعداد میں سوپور اور کپوارہ کے راستے سے ہوکر سرحد کے پار جانے لگے اور پاکستانی ریٹائرڈ فوجی افسروں کی نگرانی میں دائیر کیے گئے۔ دہشت گردی کے تربیتی کیمپوں میں داخل ہوئے جہاں انہیں پاکستانی فوجی مربی دہشت گردی پھیلانے کی تربیت دینے لگے اور ساتھ ساتھ انہیں ہند اور ہندو نفرت کی زہریلی تبلیغ سے لبریز کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اب پوری طرح بدل چُکے تھے۔

یہ تو آزاد کشمیر کے دور دراز نقاط میں ہو رہا تھا۔ اُدھر لندن میں ISI نے انگلستان میں مقیم آزاد کشمیر سے آئے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں نوجوانوں کو معرکہ ارائی کے تنور میں جھونک دِیا۔ اُنکی ذہنی دُھلائی (Brain Washing) ہوئی اور انہیں باور کرایا گیا کہ کشمیر آزاد ہونے کے بعد ان کیلئے ایک خوبصورت جاگیر بنے گی جہاں وہ اپنے املاک، عالیشان محلات اور وسیع باغات کے مالک مختار بن جائینگے اور کشمیری لوگ ان کے غلام اور

زرخرید بنیگے جس طرح مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو نوکر اور غلام بنا رکھا تھا۔ کشمیر لبریشن فرنٹ جو بعد میں جموں کشمیر لبرشن فرنٹ کے نام سے مشہور ہُوا، اِسکا انعقاد لندن میں ہی لیوٹن کے شہر میں ہُوا۔ اور امان اللہ خان نے قتل اور خونریزی کی اِس مذموم اور مردود تحریک کی بُنیاد ڈالی۔ عوام کو گُمراہ کرنے کی غرض سے اِسکو کشمیر کی آزادی کے نام سے مشہور کیا گیا۔ فرنٹ نے عوام سے بے شمار روپیہ چندہ کے نام سے اکٹھا کیا۔ امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا میں یا مشرق وسطی میں جہاں بھی کوئی پاکستانی یا ہندوستانی مسلمان مقیم تھا اُسکے ساتھ رابطہ قائم کیا گیا۔ چندہ دینے کی تلقین کی گئی اور مساجد میں نمازیوں کو کشمیر کی ہندوستان سے آزادی کی دُعا کو عام کرنے کی تمنا کی۔ فرنٹ نے یورپی ذرائع ابلاغ پر بھی ہتھکنڈے ڈال دیے۔ اپنے فعّال کارکنوں کی معرفت خلیجی ممالک بخصوص سعودی عرب کی مذہبی تنظیموں سے زرکثیر بطور چندہ حاصل کر کے یورپی اور امریکی اخبارنویسوں اور خبر رسان ایجنسیوں کو مالا مال کر دیا۔ چنانچہ امریکہ میں مقیم غلام نبی فائی اور اُسکے رفضا نے اِس کام میں بڑی مشقت کی۔ ریاض، سعودی عرب میں الرابطہ نام کی تنظیم بڑے خزانے کی مالک ہے جو ساری دُنیا میں سُنی حنفی وہابی مسلمانوں کی کافروں کے خلاف جنگ میں اِنکی بے انتہا مالی اعانت کرتی ہے۔ غلام نبی فائی نے اِسی تنظیم سے رقومات حاصل کر کے تحریک حریت کشمیر کو متحرک اور فعال بنایا۔

مف MUF کے ایک لیڈر نے فاروق کی نیشنل کانفرنس کی انتخابی دھاندلیوں کا بدلہ لینے کی ٹھان لی اور وہ کشمیر سے بھاگ کر مظفر آباد میں جاگزین ہُوا۔ جہاں وہ صلاح الدین کے فرضی نام کے تحت متحدہ محاز کو چلا رہا ہے۔ لبریشن فرنٹ کے اِبتدائی ایام میں اُسے بڑی شہرت نصیب ہُوئی اور ISI نے اُسکی مبینہ آزادی کے مشن کو رونق بخشی۔ لیکن کشمیر میں مسلح جدوجہد کی باگ ڈور تو ISI نے اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دی۔

1980ء کے عشرہ کے دوران لگ بھگ 150 ایسی تخریب کار تنظیمیں معرض وجود میں لائی گئیں جن کا کام یہ تھا کہ شہر سری نگر میں یا قصبوں میں چھُٹ پٹ دھماکے کروائے جائیں تا کہ حکومت کا اِن دھماکوں کے تئیں ردعمل کا اندازہ ہو سکے۔ دہشت گرد تنظیموں کی تعداد کو ہر ہفتے بڑھانے کے پیچھے ISI کی زبردست حکمت عملی تھی۔ ایک مقصد یہ تھا کہ انتشار اور خلفشار کے دایرے کو کشمیری مسلم سوسایٹی میں وسیع تر اور موثر تر بنایا جائے۔ دوم یہ کہ مختلف دہشت گروہ مختلف قیادت کے تحت اور مختلف مراکز عمل پر متعین ہو کر مسلح بغاوت کی مہم کو ایسا تحرک اور رسائی دیں کہ ہر کمانڈر اپنے کو اعلیٰ کمانڈر قیاس کرے اور پوری طاقت اور قوّت کے ساتھ خفیف سے خفیف ہندنواز عُنصر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے اور دوسروں کی دہشت گردی پر گوئے سبقت حاصل کرنے کا دعویٰ کرے ایک دہشت گرد تنظیم کوئی اور تنظیموں میں بانٹا گیا۔ JKLF سے حزب المجاہدین کی جماعت بن گئی اور پھر مجاہدین اسلام کو

حزب المجاہدن سے ہی اخذ کیا گیا۔ العمر مجاہدین کو مسلم مجاہدین سے اور JKLF دونوں سے اخذ کیا گیا۔ العمر کمانڈ کو سٹوڈنٹس لبریشن فرنٹ سے الگ کیا گیا۔ 1988ء میں اسامہ بن لادن نے القاعدہ کی بُنیاد ڈالی اور اسکے ساتھ ساتھ جُند اللہ نام کی ایک اور مسلح دہشت گرد تنظیم کو معرض وجود میں لایا گیا۔ دونوں نے ملکر روسی افواج کے خلاف افغانستان کے میدان کارزار میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ 1989 میں سویت افواج نے افغانستان کی سرزمین سے انخلا کا عندیہ دیا تو القاعدہ نے اِسے اپنی اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ گردانا۔ اب اِس نے بقول اسکے اسلام کے دشمنوں اور حریفوں کے خلاف جنگ چھیڑنے کی مہم کا آغاز کیا۔ چنانچہ اِسی مہم کی ایک کڑی کشمیر میں جہاد کا اعلان بھی تھا۔ اِسکے بعد پاکستان میں جو بڑی بڑی دہشت گرد تنظیمیں معرض وجود میں آئیں مثلاً حرکت المجاہدین، حرکت لانصار، لشکر طیبہ، جیش محمد وغیرہ سب درحقیقت ایک ہی لڑی کے دانہ تسبیح ہیں۔ بُنیادی مقصد یہ تھا کہ عالمی سطح پر نظام مصطفیٰ کا انعقاد ہو اِس منصوبہ میں کشمیر بھی شامل تھا۔ چنانچہ القاعدہ اور طالبان نے مشترکہ طور پر کشمیر میں منشیات کو حتی الوسیع فروغ دینا شروع کیا۔ یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جس سے جموں و کشمیر میں کئی ناہنجار پولیس اہلکاروں نے سوء استفادہ کیا۔ اِسطرح کشمیری نوجوانوں کی تباہی اور بربادی کا سامان مکمل طور پر فراہم کیا گیا۔ اِن تنظیموں کو باہمی رابطہ اور اِشتراک میں گسیل کرنے میں پاکستان کی خفیہ ایجنسی ISI نے بڑا شاطرانہ رول ادا کیا یعنی وہ اِنکے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں ایک پُل کا رول انجام دیتا رہا۔

# کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کا محرک کون؟

حقیقت امر یہ ہے کہ کشمیری پنڈتوں کے ساتھ تب ہی سے غیر منصفانہ اور غیرعادلانہ سلوک ہوتا رہا جب سے عوامی حکومت 1947ء میں برسرکار آئی۔ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کا ایمان تھا کہ کشمیری پنڈتوں نے کشمیر کے مسلمان فرقہ کے حقوق پر شبخوں مارا ہے اسلئے اب اُن سے قصاص لینے کا موقعہ آ گیا ہے۔ سیکولرازم کی اوٹ میں جتنے مظالم کشمیری ہندوں پر ڈالے گئے اِنکی مِثال مطلق العنان سلاطین کشمیر کے دورِ حکومت میں بھی نہیں ملتی۔ ہر چند کشمیری پنڈت دہلی میں جاجا کر اِن سے غیر منصفانہ سلوک کی شکایت کرتے پر اِنکی شنوائی نہیں ہوتی تھی کیونکہ جواہر لعل نہرو کی حکومت نہایت شرمناک طریقے پر ہندو فرقہ کو رُسوا اور زیر پا کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ نہرو کو شیخ عبداللہ نے کشمیر کے بارے میں مفلوج بنا کر رکھا تھا۔ نہرو کو ہر کشمیری ہندو متعصب اور شیخ دُشمن نظر آ رہا تھا۔ نیشنل کانفرنس

کے بنانے اور شیخ کی شخصیت کو اُبھارنے میں کشمیری پنڈتوں کے رول سے وہ یا تو آشنا تھا یا جان بوجھکر اُسے نظر انداز کرتا رہا۔

مرکز کی اِس غیر حقیقی اور نافرجام کشمیر پالیسی کے تناظر میں کشمیری ہندوؤں نے کشمیر میں اپنے مستقبل اور اپنے مُفاد کو بیشمار مُشکلات سے دوچار ہونے کے خدشہ میں، گھر بار چھوڑ کر کشمیر سے کوچ کر کے ذریعہ معاش کی تگ و دو میں ملک کے دوسرے حصوں کی راہ لی۔ لیکن یہ نعم البدل چند گنے چنے لوگ ہی کر سکتے تھے۔ ہر کشمیری پنڈت اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا کہ ترکِ وطن کر سکے۔ اسلئے مجبوراً انہی نامساعد حالات میں رہ کر کشمیر میں بسر اوقات کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ عرفِ عام میں اسکو آزادی ملک کے بعد کشمیری ہندوؤں کی پہلی مہاجرت کے طور پر یاد کِیا جاتا ہے۔

کشمیری پنڈتوں کی مہاجرت جو کُلھم طور پر 1990ء جنوری میں نمودار ہوئی۔ اسکے بُنیادی طور دو محرک ہیں۔ اوّل 1947ء میں پاکستانی قبایل کا پاکستانی فوج اور حکومت کی ایما پر کِیا گیا حملہ تھا۔ اِس حملے کے اصلی واقعات کا آج تک کہیں بھی ذِکر نہیں کِیا گیا ہے اور نہ ہی کِسی پنڈت نے اِسکو ضبطِ تحریر میں لایا ہے۔ ہر چند کہ وہ اِس حملے اور اسکے عواقب کا شِکار رہے ہیں۔ قبایلی حملہ بہ نفسِ خود کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کا محرک نہیں تھا۔ اصل محرک وہ صورت حال تھی جسکے تحت مقامی لوگوں نے قبائلوں کا دِل کھول کر ساتھ دِیا اور کشمیری پنڈتوں کی نشاندہی کی۔ انکے

گھروں کو لوٹا۔ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا اور اِن کے تمدنی ورثہ کو تخریب کاری کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ کشمیری پنڈت پر واضح ہوا کہ وہ ہمسایہ جسکی چکنی چپڑی باتوں کو وہ باور کر رہا تھا اصل میں ایک دھوکا تھا۔ اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ وقت بدلنے پر اُسکا ہمسایہ ہمسایہ نہیں بلکہ اُسکی جان اور اُسکے مال وجایداد کا دُشمن ہے۔ یہی ایک بڑا محرک تھا۔

دوسرا محرک عوامی حکومت کا اِن کے ساتھ سلوک ہے۔ جسکو شیخ عبداللہ کی قیادت والی حکومت نے روا رکھا تھا۔ اگر شیخ محمد عبداللہ کی اکتوبر 1947ء سے لے کر 9/اگست 1953ء تک کی تاریخ کا بڑی غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس شاطرانہ انداز میں شیخ سرینگر میں ایک بیان اور دہلی میں اِس سے الگ بیان دِیا کرتا تھا۔ اِن چھ برسوں میں شیخ انتظامیہ نے کشمیری ہندوؤں کے ایک ایک مُفاد کو روندھنے اور پامال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اِس گُفتار کی تصدیق اُس تفصیلی مکاتبہ سے ہوتی ہے جو اِسی دور میں مہاراجہ ہری سنگھ اور سردار پٹیل وزیرِ داخلہ حکومتِ ہند کے درمیان رونما ہوئی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے لفظ بہ لفظ شیخ انتظامیہ کی غیر قانونی، غیر متصفانہ اور غیر روایتی فرمان فرمائی کی داستان رقم کی ہے جو کسی بھی غیر جانبدار محقق کیلئے تازیانہ عبرت ہے۔

بخشی غلام محمد کا دورِ حکومت 9/اگست 1953ء کو شروع ہوا۔ بخشی غلام محمد واحد کشمیری رہنما ہے جو حقیقی طور کشمیریت کے زیور سے مزّین تھا۔ بخشی

مذہبی، ثقافتی اور علاقائی تعصب جیسی بدعتوں سے پاک اور منزہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اِسکے دورِ حکومت میں کشمیری ہندووں نے نہ تو ہجرت کی اور نہ ہی انہیں کِسی اہم شکایت کا موقعہ مِلا۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ اِس محبّ وطن قاید کو دہلی والوں نے بہ یک جنبش قلم حکومت سے الگ کر دیا اور اپنے لئے اور ہمارے یعنی کشمیری لوگوں کیلئے بشمول پنڈتان کشمیر آلام اور مصایب کا باب کھول دِیا۔ آج جو ہماری حالت ہے وہ اُسی احمقانہ اور ناہنجار اِقدام کا نتیجہ ہے۔ افسوس کہ آج تک بخشی غلام محمد کی شخصیت اور اِسکے کارناموں مخصوص ترقیاتی کارناموں پر کوئی بھی مستند دستاویز ضبط تحریر نہیں ہوئی ہے۔

خواجہ غلام محمد صادق نے نیشنل کانفرنس اور کشمیر کی آمرانہ مخالف جدوجہد میں سماج وادی یعنی Socialist ہونے کا جامہ پہن رکھا تھا اور اپنے کو اِسی عنوان سے دہلی میں قلمداد کرتا رہا۔ اس نے بھی اپنے زمانے میں کشمیری پنڈتوں کے حقوق پر ہاتھ ڈالنا چاہا پر چونکہ اس نے کشمیر سے زیادہ دہلی میں اپنی ساکھ بنا رکھی تھی اسلئے اُسے بادل ناخواستہ پنڈتوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنا پڑا۔ یاد رہے کہ بخشی غلام محمد کی مذہبی رواداری صادق کیلئے سوہان روح تھی۔ چنانچہ سیاسی چال باز نے سوشلزم کی مکارانہ چال کے تحت کچھ موقعہ پرست اور ناعاقبت اندیش ہندو لیڈران کو اپنا ہم خیال بنایا۔ اِن میں ڈی۔ پی۔ در اور گردہاری لال ڈوگرہ سرِ فہرست تھے۔ اور دہلی کی اعانت سے بخشی غلام محمد کی حکومت کے خلاف زبردست سازش

کر کے، بخشی حکومت کے عدل و انصاف کے دور کو نابود کر دیا۔ کشمیر کی تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے۔

1990ء میں جو کشمیری پنڈتوں کی کلھم مہاجرت رونما ہوئی اِسکے اصلی محرک کانگرس اور نیشنل کانفرنس ہیں۔ کانگرس نے ہمیشہ کشمیر کو ہندوستانی سیکولر فلسفہ کا تاج بتایا اور سیکولرازم کا سہارا اپنے سر باندھا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ کشمیر کو سیکولرازم کا نمونہ بتا کر کانگرس نے غیر مستقیم طور پر کشمیر میں رہنے والی ہندو آبادی کو معرضِ خطر میں ڈال دیا۔ چنانچہ کشمیر کے اسلام نواز حلقوں نے کشمیری پنڈتوں کو کشمیر کو اسلامیانے کی راہ میں بڑی رُکاوٹ کے عنوان سے یاد کیا۔ انہیں ایک بدعت کہکر اپنے لئے ایک بارگران گردانا۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح عمری آتش چنار میں کسی لگی لپٹی کے بغیر فتویٰ دِیا کہ کشمیری پنڈت ہندوستان کے جاسوس ہیں اور ان کے خفیہ اداروں کیلئے کام کر رہے ہیں۔ اس بے شرمانہ دروغ گوئی کے باوجود آتش چنار کتاب کو ساہتیہ اکادمی کا اعزاز مِلا۔ غور فرمائیے کہ جو شخص کشمیری پنڈتوں کو جاسوس اور ایجنٹ کہتا ہے اُسی شخص کو حکومت ہند اسکی نگارش کیلئے ایوارڈ دیتی ہے۔ اسکو کشمیری پنڈت کس تناظر میں دیکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر میں اگر ہندوستان کا کوئی مقتدر اور با رسوخ جاسوس تھا تو وہ شیخ عبداللہ تھا نہ کہ پنڈت۔

ریاست جموّں و کشمیر کی مسلم نواز اور پنڈت مخالف پالیسی روز بروز

مستحکم ہوتی گئی۔ ہندو ایک بے بس اور مجبور شہری بنکر زندگی بسر کرنے لگا۔ سیاسی، سماجی اور اقتصاری منظر میں اسکی آواز بے معنی بنکر رہ گئی اِسکا وجود کشمیری مسلم سماج میں کہیں بھی دِکھائی نہیں دیتا۔ سیاسی طور تو پنڈت اچھوت بن کر رہ گیا۔ جس طرح کی جمہوریت اب وجود میں آئی اسمیں پنڈت کو کوئی مقام نہیں ملا۔ طرہ یہِ کہ اسکی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ وہ ِکسی کا ووٹ بنک نہیں تھا۔ مجبوراً چھوٹی چھوٹی نوکریوں پر گذر اوقات کرنے پر مجبور تھا۔ سرکار حلقوں میں اِسکی آواز گُم ہو چُکی تھی۔

اِس ظلم وستم کے باوجود کشمیری پنڈت بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں اپنی محدودیت کو سمجھ کر بسر گذر کر رہا تھا۔ جھڑکیاں سنتا رہا محرومیاں جھیلتا رہا۔ امتیازی سلوک کے باوجود مُنہ سے اُف تک نہیں نکالتا تھا۔ اِسے اپنے وجود پر ترس آتا تھا۔

اُدھر کشمیر کے مسلمان روز بہ روز پاکستان کے پروپگنڈا کا شکار ہوتے گئے۔ انہیں باور کرایا گیا کہ ہندوستان میں افلاس اور ناداری جیسی لعنت ازل سے وہاں کے لوگوں کے نصیب لکھی گئی ہے اور اسکے مقابلے میں پاکستان میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور مومنوں کو صدائے عام دے رہی ہے کہ آو اور اس نعمت لایزالی سے بہرہ مند ہو جاو۔ اسلامیت کا دور دورہ گھر گھر، محلّہ محلّہ اور گاؤں گاؤں پھیلایا گیا۔ اللہ والوں نے تبلیغی کام میں پیش از پیش حصہ لِیا۔ جماعت اسلامی حرکت میں آئی۔ سینکڑوں بلکہ

ہزاروں جماعت اسلامی درسگاہیں کشمیر کے طول وعرض میں کھولی گئیں جہاں دینی تبلیغ کیلیئے ہر خواندہ اور ناخواندہ ملاّ کو وعظ خوانی پر لگایا گیا۔ ہند مخالف اور ہندو مخالف پروپگنڈا اوڑنا اور بچھونا بن گیا۔ لوگوں کے ریش دراز اور ان کے شلوار کوتاہ ہوتے گئے۔ ہر مسجد کے باہر بڑی بڑی تختیوں پر مشہور محدوثوں کے مقولات جلی حروف میں رقم کیئے گئے کہ سچا مومن کون ہے اور دغل باز کون۔ لوگوں کا اندازِ کلام وسلام بدل گیا۔ خدا حافظ کو خیر بعد کہہ کر اللہ حافظ کو رواج دیا گیا کیونکہ کلمہ خدا کا ریشہ اوستائی ایرانی ہے اور اللہ کا ریشہ عربی اور قرآنی ہے۔ ہر درو دیوار پر ''نماز قائم رکھو'' کا نعرہ تحریر ہوا نظر آنے لگا۔ لوگوں نے عربی لباس کا فیشن اپنانا شروع کیا یعنی ایک سفید لبادہ اور سر اور گردن میں بڑی تکونی رومال۔ مسلم خواتین نے یکدم انگریزی اور نیم عریاں لباس ترک کر کے حجاب اور نقاب اوڑھ لیے اور اب سیاہ خیموں میں متحرک یہ خواتین کوچہ و بازار کی زینت بن گئیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشن گویا اسلامیات کے گروگان بن گئے۔ ہزاروں مساجد نمازیوں کی درود خوانی اور موذّن کی بانگ مسلاۃ سے گونجنے لگیں۔ اُردو صحافت کاروں نے اپنی راہ و روش بدل ڈالی۔ ہندوستان کی مذمت اور ہندی تہذیب و تمدن کی تکذیب اور قباحت ان کا دلپسند موضوع بن گئے۔ ہر طرف مساجد پر لاوڈ سپیکر لگا کر یوپی اور بہار سے لائے گئے کٹھ ملّے ہند مخالف زہر اُگلنے میں ایک دوسرے پر گو سے سبقت لینے کی دوڑ لگا رہے تھے۔

ہندوؤں کے ساتھ علیک سلیک تک کا رشتہ قطع کیا گیا۔ کشمیر کے گاؤں میں کسی پنڈت کیلئے کام کرنا مذہب سے بے وفائی کرنے کے برابر تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں پناہ لئے ہوئے کشمیری پنڈت پناہ گزینوں کے ساتھ ہر طرح کے رسم و روایت کو مقطع کرنے کی تلقین کی گئی۔

طرہ یہ کہ سرکاری مشینری ان وہابیوں کی ہم پیالہ اور ہم نوالہ بنتی رہی۔ وہ اپنے منصبی فرائض کو مذہب کے عینک سے دیکھنے لگی۔ انتظامیہ تعصب اور فرقہ پرستی کا آلہ کار بن گیا۔ سکریٹریٹ کے کمروں کو نماز گاہوں میں تبدیل کیا گیا۔ گویا کشمیر سیکولر ہندوستان میں اسلامی ریاست بنتا جا رہا تھا۔ رہن سہن اور کلام وسلام کا طور طریقہ بدل گیا۔ ہوا میں ہند نفرت کی بو آنے لگی۔ ہندوستانی ترنگا تمام اداروں، دفتروں، مکانوں اور عمارتوں سے غائب ہو گیا۔ سیکولر ہندوستان میں ایک فرقہ وارانہ ریاست برسرکار آئی۔

یہ سب کچھ ہندوؤں کی دل آزاری کا سامان بنتا گیا۔ ہندوؤں میں اِس بات کا احساس ہوا کہ ان کیلئے اب نہ پائے رفتن اور نہ جائے ماندن والی بات بن گئی۔ کشمیر سے جلاء وطن ہونے سے بہت پہلے انہیں احساس ہونے لگا کہ وہ اپنے ملک میں نہیں بلکہ ایک غیر ملک اور اسلامی ملک میں زندگی بسر کر رہے ہیں ہاں بس اتنا تھا کہ نہ تو ان پر ابھی تک جزیہ عاید کِیا گیا تھا اور نہ ہی انہیں مشخص کرنے کیلئے بازوں پر سیاہ یا سبز

بازو بند باندھنے کا حکم ملا تھا جسطرح کہ اسلامی خلافت میں اہل جہود پر لاگو تھا۔ اب اگر اہل اسلام کا کوئی دُشمن تھا تو وہ کفر اور کافر تھا۔ انصاف فرمائیے کہ کیا یہ سب کچھ کشمیر پنڈتوں کی ہجرت کا سامان نہیں تھا۔ اِس لاوے کا ڈھیر بنتا گیا۔ اور اب اس میں چنگاری دکھانے کی ضرورت تھی تو یہ آتش سوزان سارے کشمیر کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لینے کیلئے تیار بر تیار تھا۔

1989ء میں بم دھماکے کیئے گیئے۔ اِکا دُوکا گولیاں چلنی شروع ہوئیں۔ خفیہ اجتماع ہوتے گئے جہاں مسلح بغاوت کے چرچے اور منصوبے بنائے جانے لگے۔ ''سوپور، کپور تہِ اپور'' کا نعرہ ہر سو بلند ہوا۔ کپوارہ کی سرحد پر حفاظتی عملہ بقول افواہ سو دوسو روپے کے عوض میں رضا کاروں کو سرحد پار کرنے کی اِجازت دیتا رہا اور چند ہی ہفتوں میں ہزاروں کی تعداد میں کشمیری مسلمان نوجوان آزاد کشمیر میں لگائے گئے دہشت گردی کے تربیتی کیمپوں میں شامل ہو گئے۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسی ISI کا منصوبہ مشن Topac کامیابی سے ہمکنار ہوتا دکھائی دینے لگا۔ 14/ستمبر 1989ء کو دِن دہاڑے صبح سویرے کشمیری پنڈتوں کے نہایت مقبول لیڈر اور BJP کے ریاستی صدر ٹکالال ٹپلو کو کشمیری بندوق برداروں نے اپنے مکان واقع حبہ کدل کے باہر گلی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اِس طرح سے جہاد اسلامی کا نعرہ بلند ہوا اور جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے اسلامی جہاد کا آغاز معصوم کشمیری پنڈتوں کے قتل سے شروع ہوا۔

پاکستانی بندوق بشمول مُقامی لوگوں کے تعاون نے اِن کو وادیٔ سے نِکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ پنڈتوں کے خلاف زہرالود ماحول بنایا گیا۔ یہاں تک کہ پانچ سو سے زائد لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی طور وحشیانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ اِس پر طُرہ یہ کہ آج تک ایک قاتل کے خلاف نہ پرچہ کٹا اور نہ مقدمہ دائر ہُوا۔ اِنسانی تواریخ میں ایسی بے راہ روی شاید ہی کہیں ملتی ہوگی۔

ہر چند اِس فرقے نے کوشش کی کہ واپس اپنے مادرِ وطن کو لوٹیں۔ مگر مُقامی سطح پر ان کے منصوبوں پر پانی پھینکا گیا۔ 2008ء میں PMs Package کو آج تک عمل در آمد نہ کِیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ ایڈمنسٹریشن میں ایسے عناصر سرگرمِ عمل ہیں جو پنڈتوں کی واپسی میں براہِ راست روڑا اٹکا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 2014ء میں اِنٹرلکیوٹرس کی ٹیم نے اپنی حتمی رِپورٹ میں Twin City میں اِن کی باز آبادکاری اور واپسی کے فارمولا پر زور دِیا۔ یہ رِپورٹ مرکز میں UPA 2nd کو پیش کی گئی تھی۔ تبھی شعبدہ باز سیاسی عناصر اُسکے خلاف ہو کر رخنہ ڈالنے لگے۔ اجتماعی باز آبادکاری میں اِس فرقہ کو سیاسی اختیارات کی حوصلہ یابی کا اندیشہ اِن عناصر کو کھٹکتا رہا۔

''کشمیری پنڈتوں کی داستانِ دار و رسن'' اِس قوم کی بدنصیبی کی کہانی ہے نہ اِن کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے اور نہ آزاد کِیا جاتا ہے۔ بلکہ غیر یقینی صورت حال ''دار و رسن'' کی کہانی اپنی زبانی بیان کرتا ہے۔

کسی بھی قوم کو فعال رہنے اور باوقار زندگی بسر کرنے کیلئے جسمانی اور ماحولیاتی تحفظ کے علاوہ سماجی اور ثقافتی تسہیلات فراہم ہونا لازمی ہے۔ ذکر اور فکر کی آزادی اور سماج کی طرف سے قبولیت لازمی باتیں ہوتی ہیں۔ اسکی اقصادیات محکم اور مضبوط ہونے چاہئیں اور اسے سیاسی صاحبان قدرت کی حمایت اور پشت پناہی کا تعاونِ لازمی ہے۔ ان تمام باتوں کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری پنڈت ہر حالتِ میں اور ہر زاویے سے اپنے کو اپنے ہی گھر میں بیگانہ یا اجنبی بن کر رہنا پڑتا تھا۔

یہاں میں قارئین گرامی کی توجہ ایک اہم تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کرنا چاہوں گا۔ عام لوگوں کو اسلامی تاریخ اور اسلامی معاشرے کے اہم اور بارز اصولوں کا زیادہ علم نہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کو بھی اسکی پوری جانکاری نہیں۔ اسلامی تاریخ میں اقلیتی فرقہ کے ساتھ رفتار و سلوک کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اسلامیوں نے ہمیشہ اپنے کو اور اپنے تمدن کو باقی اقوام اور باقی تمدنوں پر فوقیتِ دی ہے۔ اسلامی خلافت میں غیر مسلموں کے ساتھ برابر کا سلوک کرنے کو غیر ضروری بتایا گیا ہے۔ اقلیتوں کو ان کے جانی تحفظ کیلئے جزیہ دینا پڑتا تھا۔ انہیں مسلمانوں سے تمیز کرنے کیلئے باز و پر کالے یا سبز رنگ کی پٹی باندھنی پڑتی تھی۔ وہ اسلامی فوج میں شامل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان پر بھروسہ نہیں تھا ان کی ایمانداری پر شک کیا جاتا تھا اور اسکے عوض ان کو جزیہ دینا پڑتا تھا۔ ان کی الگ سماجی شناخت بطور ذمی

ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ یہ ہتک آمیز اِمتیازی خصلت مسلمانوں کی ذہنیت میں رس بس گئی ہے۔ اسلئے مسلمان کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو برابری کا درجہ دینے پر رضامند نہیں ہوتے ہیں۔

کشمیری مسلمان اسی امتیازی ذہنیت کے شکار تھے۔ کشمیری ہندو اسطرح کی امتیازی ذہنیت سے آزردہ اور اسکے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری ہندوؤں نے مسلمان کی اِس طرح امتیازی ذہنیت سے تنگ آ کر اُن کے ساتھ سماجی راہ و رسم کو محدود کیا ان کو ملیچھ کہا اور ترک موالات سے کام لیا۔ یہی ذہنیت آج تک کشمیری مسلمان پر چھائی ہوئی ہے۔ اِسی ذہنیت کو کشمیری پنڈتوں کے 1990 میں مکمل اخراج کا محرک خیال کرنا چاہیے۔

جو لوگ اسلامی تاریخ سے تعلق نہ رکھکر اِسکے مطالعہ سے بے خبر رہے ہیں وہ بہت ساری غیر حقیقی باتوں کی اصلیت تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ کشمیر میں ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ تھا بے معنی سی بات ہے۔ ہندو اپنی اقلیتی کردار کی بنا پر مجبور تھا کہ وہ سماجی تسہیلات سے محروم رہتا اور اُس نے چار ناچار اِس صورت حال سے نباہ کیا تھا۔ اور ادھر مسلمان اپنے اکثریتی کردار کی بنا پر ہندو کو اسکی ہر بات ماننے کیلئے مجبور کرتا تھا۔ کیا یہ بھائی چارہ ہے۔ کشمیر سے ہندوؤں کے انخلا کے محرکات وسیع اور گہرے ہیں جسکا ذِکر یہاں ہو چکا ہے۔

کشمیری پنڈتوں کی کہانی انسانوں کے انسانوں پر مظالم اور

مصائیب ڈھانے کی دردناک کہانی ہے۔ انسان دروغ گوئی، بہتان تراشی اور مذہبی تعصب کی گہرائیوں میں کِس حد تک جا سکتا ہے، یہ سب کچھ اور اِس سے بھی کُچھ زیادہ اِس کتاب کے ابواب کے مطالعہ سے سامنے آئیگا۔ کِتاب مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ کشمیر میں مذہبی اقلیت کے ساتھ بے انتہا نازیبا اور امتیازی سلوک کی اصل داستان اِن حقائق سے کِس قدر مختلف ہے جسکا پرچار دروغ گو میڈیا اور پریس کرتا آیا ہے۔ ہماری حقیقت یہ کہ ہے کہ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

☆☆☆

# کشمیری پنڈتوں کی بازآبادکاری کا مسئلہ

آنکس کہ در بدرم کرد مرا ز خانۂ خویش
خدا کُند کہ در بدر شود ز خانہ خویش

(لاہوتی)

جہادیوں نے 1989-1990ء کے دوران کشمیر میں مسلح بغاوت چھیڑ کر یوں تو حکومت کے خلاف تحریک چلائی لیکن انہوں نے سب سے پہلے نہتے پنڈتوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔ ہر ہلاکت کے جواز میں بیان آتا تھا کہ مقتول مخبر ہے۔ چُن چُن کر پنڈتوں کو گھروں میں، دفتروں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، بسوں میں جہاں تہاں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ یہ کشمیر کی آزادی کی نہیں بلکہ کشمیر سے ہندو اقلیتی فرقہ کو نکالنے کی سازش تھی۔ اس سازش میں کشمیر میں اِس وقت کی کانگرس ۔ نیشنل کانفرنس مخلوط حکومت بلا شبہ ملوث تھی۔ کیونکہ اگر ملوث نہ ہوتی اور محبّ وطن

ہوتی تو ہر گز اُس نازک وقت پر استعفیٰ دیکر حکومت سے الگ نہیں ہوتی۔ چونکہ ہندوں کو کشمیر سے نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا، لہذا اسکے پس منظر میں اس مخلوط حکومت نے یہی فیصلہ لیا کہ وہ اقتدار سے الگ ہو جائے۔ تا کہ سبکدوش ہونے پر اِلزام پاکستان اور اسکے مسلح دہشت گردوں پر آئے۔

اِس بات کی تصدیق ایک اور دلیل سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حکومت سے الگ ہونے کے بعد جب دہلی والوں نے جگموہن کو گورنر بنا کر بھیجا اور اِسے ہدایات دی گئیں کہ وہ بغاوت کو فرد کرنے کا پورا اقدام کرے تو کانگریسی، کانفرنسی اور دیگر تمام پاکستان نواز عناصر نے جگموہن کے خلاف زبردست مورچہ بندی کی۔ اُسے بدنام اور بے آبرو کرنے کی ہر طرح کی کوشش کی۔ اسکے خلاف بہتان تراشی سے کام لیا اور یہاں تک کہ پاکستان کی وزیر اعظم تک کو اُکسایا گیا کہ وہ آزاد کشمیر میں عوامی جلسوں میں کھلے بندوں گورنر جگموہن کو ہٹانے کی مانگ کریں۔ جب پارلیمانی وفد صورت حال سے نپٹنے کیلئے سری نگر آیا تو راجیو گاندھی نے گویا مسخرانہ رول ادا کیا۔ اسکی جبیں پر ذرا سی چین نہ تھی کہ کشمیر تباہی کے کس دہانے پر آ کھڑا ہو چُکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِسے معلوم تھا کہ جو سازش اِسکی پارٹی اور نیشنل کانفرنس نے کشمیری ہندوں کی تباہی کیلئے رچی تھی وہ کامیاب ہو رہی تھی اور دونوں پارٹیوں کے سربراہ بغلیں جھانک رہے تھے۔

کشمیری ہندوون کے خلاف قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ حکومت

استعفیٰ دیکر الگ ہو گئی۔ مستعفیٰ وزیروں نے جموں کی راہ لی۔ سرکاری بنگلوں پر زبردستی قبضہ کیا کیونکہ بازخواست کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پولیس والوں کو اپنی حفاظت اور سیکورٹی پر لگایا کیونکہ پولیس والوں کو کسی کو جواب دینا نہیں تھا کہ اِن مستعفیٰ وزیروں کو نہ تو بنگلوں میں داخل ہونے کا حق تھا اور نہ ہی پولیس سیکورٹی کا۔ پولیس والے مصلحتاً بندوق برداروں کو خوش رکھنے پر آمادہ ہوئے گورنر کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ فوج کو حکم تھا کہ بارکوں سے باہر نہ آئے۔ اب غور کیجئے کہ پنڈتوں کیلئے فرار کے علاوہ بچنے کی اور کون سی صورت تھی۔ اور جب اُردو اخباروں اور مسجدوں سے لاوڈ سپیکروں پر نعرہ دیا گیا کہ پنڈت کشمیر چھوڑ کے چلے جائیں لیکن مستورات کو یہیں چھوڑ جائیں، تو پھر کیا تھا۔ 19/جنوری 1990ء کی رات کا منظر کئی لوگوں نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اسکے اعادہ کی احتیاج نہیں۔ مارچ 1990ء تک کشمیر ہندووں کے وجود سے خالی ہو گیا۔

جموں میں آکر پنڈتوں نے اپنی کج فہمی کی بنا پر یہ سوچا کہ سردیاں گذرنے کے ساتھ کشمیر وادی میں حالات سدھر جائینگے اور وہ واپس اپنے گھروں کو جائینگے۔ حالات ابتر ہوتے گئے۔ ان کے خالی مکانوں کا لوٹ شروع ہوا۔ ڈھانچہ وہیں رہا لیکن اثاثہ معدوم ہو گیا۔ محلّہ والوں نے کہا دوسرے محلے کے چور اُچکے آگئے اور گھر لوٹ پاٹ کر کے چلے گئے۔ کسی نے افشانہ کیا کہ اُن کا رول اس لوٹ میں کیا تھا۔ لوٹ کے بعد دروازے،

کھڑکیاں اکھاڑ کے لے گئے اور مکانوں کو اگر وہ گھنی بستی میں نہ تھے سپرد آتش کیا گیا۔ یہ مکانات خاکستر کا ڈھیر بن کے رہ گئے۔ اسکے بعد ان خاکستر کے ڈھیروں پر دست اندازی کی گئی اور صحن، باغ اور سبزی کاری کے رقبہ جات ہتھیائے گئے محکمہ مال کے ریکارڈ میں ملکیت بدلی گئی۔ ہندوں کے کالم میں مفرور کا لفظ استعمال کیا گیا اور اسطرح ان کے وجود کو ہی ختم کرنے کا سامان مہیا کیا گیا۔ مکان تو مکان مندروں، دیوستھانوں، آشرموں، دھرم شالہ کی اراضی پر دست تطاول دراز کیا گیا۔ غرضیکہ پنڈتوں کے گھر واپس آنے کے تمام راستے بند کر دئے گئے۔

ریاست کے حکمرانوں نے بھانپ لیا کہ اب کشمیری پنڈت واپس آنے کی حالت میں نہیں ہے تو ہر در و بام سے آواز بُلند کی گئی کہ پنڈت تو ہمارے معاشرے کا جز و لاینفک ہیں ان کے بغیر کشمیر کا معاشرہ اُدھورا اور ناخیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ بڑی چکنی چپڑی باتیں بتائی گئیں اور دہلی کے نااہل حکمران اِن فریب کارانہ اور مکاّر نعروں میں آکر باور کرنے لگے کہ ہاں کشمیری مُسلمان پنڈت کے واپس آنے کا خواہاں ہے۔ ریاستی سرکار نے اِس وعدے پر کہ پنڈتوں کی بازآبادکاری انجام دی جائیگی۔ کروڑوں، اربوں روپے دہلی والوں سے اینٹھ لئے۔ دینے والوں میں اِتنا حوصلہ نہیں کہ اِن بھاری رقومات کا حساب مانگیں روپیہ ہضم اور پنڈتوں کی واپسی ختم۔

اب پنڈتوں کی واپسی ایک سیاسی حربہ بنایا گیا ہے۔ ریاستی قیادت اپنے آپکو معصوم جتانے کیلئے بار بار پنڈتوں کو واپس بُلانے کا منتر رٹ رہی ہے۔ لیکن نہ کوئی مخصوص باز آباد کاری کا پُلان ہے۔ اور نہ ہی فرقہ کے بُزرگ رہنماؤں سے کوئی مشورہ کِیا جاتا ہے۔ چند ایک جھولی بردار اور زلہ خوار بنا رکھے ہیں اور اِن پر قوم کی رہنمائی اور قیادت کا لبادہ ڈالا گیا ہے۔

2008ء میں کانگرس کی حکومت تھی۔ وزیر اعظم سردار منموہن سنگھ اکھنور پُل کی رسم افتاح کے موقعہ پر اکھنور میں آئے اور ایک پبلک جلسہ میں اعلان کِیا کہ مہاجر پنڈتوں کیلئے ایک ہزار چھ سو اٹھسٹھ کروڑ روپے کا پیج دِیا جائیگا۔ ذرائع ابلاغ نے اِسکی تشہیر جہاں تک ہوسکتی تھی کر لی۔ پنڈتوں نے اپنی نادانی یا معصومیت کا اِظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم کی ہمدردی کے جذبہ پر شُکریہ ادا کِیا۔ لیکن جب اِس پیکیج کا غور سے مطالعہ کِیا گیا تو کچھ اور ہی منظر سامنے آیا۔ دیکھا گیا کہ عوام کو دھوکا دینے کی غرض سے اِسے کشمیری مائیگرنٹ لوگوں کیلئے پیکیج کا نام دِیا گیا ہے اگرچہ دراصل پیکیج میں کُل مِلا کر پانچ قسم کے گروہ کی نِشاندہی کی گئی تھی جِن میں چار گروہ کشمیری اکثریت سے وابستہ تھے اور پانچواں گروہ کشمیری مہاجرین کا تھا۔ گویا 1618 کروڑ روپے میں کشمیری پنڈتوں کا حصہ صرف پانچواں یعنی حد اکثر 325 کروڑ تھا۔ اور اِسکے باوجود اِسکو کشمیری پنڈت مہاجرین کے پیکیج کے نام سے مشتہر کِیا گیا اور اِس طرح کانگریس حکومت نے لوگوں

کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ اب پنڈتوں کی باز آبادکاری کا مسئلہ پھر سے شد و مد سے اُٹھایا جا رہا ہے۔ جب پی۔ڈی۔پی اور بی۔جے۔پی کی مخلوط سرکار بنانے کی بات چلی تو فریقین نے چھ ہفتوں تک باہمی معاہدہ کی شرائط طے کر لیں۔ ایک شرط اِس معاہدے میں یہ ہے کہ پنڈتوں کو کشمیر میں یکجا بسایا جائیگا۔ گذشتہ جون 2015ء کے مہینے میں مرحوم وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید اور وزیر اعظم نریندر مودی کے درمیان دہلی میں اِس موضوع پر گفتہ و شنید ہوئی۔ دونوں نے اِتفاق کیا کہ کلہم مہاجرین کو یکجا یعنی Concentrated طور پر وادیٔ میں بسایا جائیگا۔ چنانچہ گفتہ وشنید کے بعد ایک اعلان کیا گیا جس میں دونوں لیڈروں نے اِس معاہدے کا اعادہ کیا۔

لیکن اِس اعلان کے بارہ گھنٹے میں ہی کشمیر میں قیامت بپا ہوئی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے جلوس نکالے اور پنڈتوں کی واپسی پر صدائے احتجاج بُلند کی۔ نہ صرف علیحدگی پسند قیادت نے بلکہ کشمیر کی ہر ایک سیاسی پارٹی کے رہنماؤں نے پنڈتوں کی واپسی کی مخالفت پورے زور سے کی۔ کشمیر وادیٔ میں ہڑتال کی کال دی گئی۔ سارا کشمیر ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اِس دِن کِسی پرندے نے پر تک نہ مارا۔ اِنسانوں کی حرکت درکِنار۔ طرّہ یہ کہ اسمبلی میں ہر پارٹی کے منتخب نمایندوں نے عالم بالا اُٹھایا۔ دھواں دار تقریریں جھاڑی گئیں۔ اِلزام لگایا گیا کہ ہندوستان

جاسوسوں کو کشمیر میں بسانے جا رہا ہے اور اسطرح مسلمانوں کی شناخت، اُنکی اِنفرادیت اور اِن کے ثقافتی اور دینی نظریات کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ حیرانگی کا مقام یہ تھا کہ اسمبلی کے اِس مخالفانہ، متخاصمانہ احتجاج پر بی۔جے۔پی کے 25 ممبران خاموش تماشائی بن کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے منہ سے ایک کلمہ بھی نہ نکالا چہ جائے کہ وہ ایوان سے اُٹھ کر چلے جاتے، تاکہ اِن کا احتجاج رکارڈ ہوتا۔ وزیر اعلی مفتی سعید ایوان میں بہ نفس نفیس موجود تھے اور ''چشم بند و گوش بند و ہوش بند'' ہو کر منتخب شُدہ اراکین کی اسمبلی ہال میں معرکہ ارائی اور مورچہ بندی کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دو گھنٹے کا شور شرابہ جب خاموش ہوا تو اُن کے دہن شریف سے یہ کلمہ نکلا کہ ''پنڈت آینگے تو اپنے گھروں کو جاینگے'' داد دیجئے یہ ہے کشمیر کے وزیر اعلی کا ردعمل اُس صورت کا جِس میں انھوں نے دہلی میں وزیر اعظم سے مِل کر پنڈتوں کو واپس کشمیر لے جانے کا مصمم ارادے کا اِظہار کِیا تھا۔

پنڈتوں کے مخالفین کا قول ہے کہ پنڈت آئیں پر اپنے اپنے گاؤں قصبوں یا شہر میں اپنے آبائی مکانوں میں ہی جا بسیں۔ وہ ایک جگہ اکھٹے ہو کر نہیں بسائے جاینگے۔ ہم نے سطور بالا میں تفصیل سے بتایا کہ پنڈتوں کو کِن حالات میں گھروں سے نکالا گیا۔ نکالنے کے بعد اِن کے خالی کئے گئے مکانوں کے ساتھ کیا حشر ہوا اِنکی املاک، باغات، دوکانوں اور غیر منتقل جائیداد پر کیا گذری۔ اب غور فرمائیے نہ اِسکے پاس مکان، نہ

مکان کی جائیداد، نہ زمین، نہ دوکان، نہ باغ نہ بُنیاد۔ اور کشمیری کہتا ہے کہ واپس گھر جاؤ لیکن اکھٹے بسنے نہ دینگے۔ اسکے برعکس جِن لوگوں نے انہیں گھر بار سے دربدر کیا اُنہی لوگوں نے جموں میں آکر سرما کی رہائش کیلئے مکان اور محلات بنائے۔ 27 ہزار مکان شہر جموں کی نواحی میں اِن لوگوں نے بنائے۔ کچھ محلات تو کلی طور مسلمانوں کی ہی بستیاں ہیں مثلاً گوجرنگر، بھٹنڈی، نارووال، سدرہ وغیرہ وغیرہ۔ جموں کے لوگوں نے یہ نہ کہا کہ یہاں آکر نہ بسیں کیونکہ ایسا کرنے سے جموں کی آبادی کے تناسب میں خلل پڑے گا۔ کشمیریوں کے عدم برداشت intolerance کا اندازہ اِسی ایک مِثال سے کیا جا سکتا ہے۔

اِن تمام حالات کے پیش نظر یہ خیال کرنا کہ کشمیری پنڈتوں کی باز آبادکاری میں کِسی بھی کشمیری کو دلچسپی ہے سراسر غلط فہمی اور مبالغہ آمیزی ہے۔ پنڈت اِن حالات سے بخوبی آشنا ہیں اور کشمیر کے سرکاری حلقے بھی اِس حقیقت سے آگاہ ہیں۔

البتہ دہلی والوں اور بخصوص بی۔جے۔پی کے ارباب اقتدار کو یہ باور کرانے کیلئے کہ وہ کشمیری پنڈت مہاجرین کے تئیں حسن ظن رکھتے ہیں انہیں واپس بُلانے کی بات کرتے ہیں اور اِسی بہانے کروڑوں روپے اینٹھ لیتے ہیں۔ خام خیالی میں دہلی کے ارباب بست وگشاد اِن کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پنڈتوں پر ہی شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

پنڈت صاحبان بخوبی جانتے ہیں کہ سرکاری حلقے نہ اُن کے واپس آنے میں خوش ہیں اور نہ ہی اِن کے بسنے سے اِتفاق کرتے ہیں۔ اِسی لئے سرکاری حلقے آئے دِن شوشہ پھیلاتے رہتے ہیں کہ پنڈتوں کے بغیر کشمیر اُدھورا ہے یا کہ پنڈت کشمیریت کا جزو لاینفک ہیں۔ یہ سب بہتان تراشی اور دِل آزاری ہے۔

کشمیریوں کی بازآبادکاری کا اولین کام یہ ہے کہ حکومت اعلان کرے کہ کشمیری مہاجرین کا اِتنا ہی حق ہے جتنا کِسی اور فرقہ کا ہے۔ دوم یہ کہ کشمیری مہاجرین وادیٔ میں جہاں بھی جِس طرح بھی پھر سے بسنا چاہیں حکومت اُنکی حمایت کرے گی کیونکہ قانونی طور ہر ہندوستانی شہری کو حق ہے کہ وہ ملک کے کِسی بھی کونے میں کِسی بھی شکل میں چاہیئے سکونت اختیار کرے، اِسکے بعد دوسرا مرحلہ یہ آئے گا کہ سرکار ایک مخصوص رقبہ اور موضع کی نشاندہی کرے جہاں پنڈت لوگوں کی پھر سے آبادکاری ہو سکے۔ انہیں آٹھ آٹھ یا دس دس مرلہ زمین فی کُنبہ کے حِساب سے بطور عطیہ دی جائے۔ مکان کی تعمیر کیلیئے لکڑی، اینٹ، پتھر اور سیمنٹ رعایتی قیمتوں پر مہیا کِیا جائے۔ مکان کے چھتوں کا ٹین مُفت دِیا جائے اور اسکے علاوہ گھر کے بسانے کیلیئے کم از کم تسہلات رعایتی قیمتوں پر میسر کرائے جائیں۔

اِن سب کے علاوہ اہم ترین کام یہ ہے کہ انہیں کم از کم دس سال تک کوئی معقول ذریعہ معاش فراہم کِیا جائے۔ تب جا کر وہ دس سال کے

بعد ہوش سنبھالیں گے کہ ہم پھر سے آباد ہو رہے ہیں۔ پنڈتوں نے ایک نئے شہر کو بسانے کی تجویز پیش کی ہے۔ اِس تجویز کو پنڈت صاحباں نے بڑے غور و خوص کے بعد قبول کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ سرکاری حلقوں نے نہ تو اِسکو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی اِس فارمولا کے مثبت پہلو پر کوئی رائے ظاہر کی۔ تعجب اِس بات کا ہے کہ وادی کے اُردو اور انگریزی اخباروں نے اِس تجویز کو جلی حروف میں چھاپا۔ کسی بھی کشمیری سیاست دان یا دانشور یا صحافت کار نے اِس مشورہ کی مخالفت نہیں کی اِتنا ہی نہیں سماج کے ایک جانے مانے اور پختہ کار دانشور نے حریت کانفرنس کے سابقہ صدر سے بھی یہ معاملہ چھیڑا۔ اِسکا ردعمل بہت مثبت تھا بلکہ اُس نے قول دیا تھا کہ وہ پنڈت صاحبان کی اِس تجویز کو حریت کے اعلیٰ کمان کے سامنے رکھے گا۔ لیکن چونکہ حکومت ہند کی طرف سے اِس ضمن میں کوئی بھی مثبت اشارہ نہ مِلا اسلئے حریت والے بھی خاموش بیٹھ گئے۔

کشمیری مہاجرین کی گھر واپسی اور بازآبادکاری کے ضمن مین ہم پوچھنا چاہینگے کہ کیوں آج تک جموں کشمیر کی سرکار نے کوئی قابل عمل اور دانشمندانہ فارمولا پیش نہیں کیا۔ کبھی کلسٹر آبادی کی بات کی کبھی ٹرانزشن کیمپ اور کبھی مندروں میں قیام کی بے تکی اور بے معنی باتیں کرتی رہی جس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ سرکار کے پاس کوئی مبسوط پالیسی اور پروگرام نہیں ہے۔

اِدھر پنڈت صاحبان بھی اپنی روایتی نفسا نفسی کے قاسد اور تخریب کارانہ چال کے شایقین ہونے کی وجہ سے دوسروں کو جھٹلانے اور اپنا اُلو سیدھا کرنے کے درپے ہیں۔ اِن میں سیاسی شعور کا فقدان ہے اور حکمت عملی نام کا کوئی ہُنر ان کی کتاب میں نہیں۔ اور سرکار چاہیے دہلی کی ہو یا سری نگر کی اِن کے اس نقطہ ضعف سے بخوبی واقف اور اِسی کی آڑ میں اِنکو چٹکیوں میں پسپا کرتی ہے۔

بیدار ہو دِل جسکی فغان سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے ناپید

کشمیری مہاجرین کی باز آبادکاری کے ضمن میں چند بُنیادی باتوں کو ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ دو قوموں یعنی کشمیری ہندو اور مُسلمان کے درمیان جو حیا اور احترام کا رشتہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا اِس میں شگاف آیا ہے اور اِس زخم کا اندمال ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پنڈتوں کیلئے ذریعہ معاش کا سوال بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ قوم اپنی بدقسمتی سے فقط نوکری پیشہ ہے تجارت، دستکاری، ہنر اور دیگر ذرائع معاش کی طرف وہ جاتا نہیں۔ اِدھر کشمیر میں مُسلمان باشعور بن چُکے ہیں۔ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں انہیں ریزرویشن ملی ہوئی ہے۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر پنڈتوں کا اونچی سطح کی پوسٹوں پر پہنچنا بعید از قیاس ہے۔ KAS اور IAS، IFS، IAC اور دیگر قومی

سطح کی سروسز سے اِن لوگوں کی دلچسپی بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے ہر چند کہ ان کے اندر ان اعلیٰ امتحانات کو پاس کرنے کی صلاحیت اور استعداد بھی ہے۔ اب غور فرمایئے ایسی قوم کیلئے کون سرکاری نوکریاں پیش کرے گا۔ اور پھر کشمیر میں تو کِسی ہندو کو سرکاری ملازمت میں لگانا گناہ عظیم کے برابر ہے۔ لہذا اِن لوگوں کی واپسی بے انتہا مشکل ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی مہاجر کو نوکری مِل بھی جائے تو وہ شہر سری نگر میں ہی رہنا پسند کرے گا اور خطرہ جان کا بہانہ بنا کر دور دراز گاؤں اور قصبوں میں نوکری نہیں کرے گا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ تقریباً ہر مہاجر نے جموں اور دہلی یا دیگر شہروں میں کم و کاست رہایش گاہ بنا رکھی ہے۔ اِن میں نہ تو کشمیر میں مکان بنانے اور زمین خریدنے کی استطاعت ہے اور نہ ہی ضرورت ہے۔ ان کے ہاں ایک بچے سے علاوہ عیال نہیں۔ ان مکانات کی دیکھ بال کون کرے گا۔ اِنکی آبادی میں ہر سال ڈیڑھ فیصد کی کمی ہو رہی ہے۔

اِن حالات کے باوجود اگر کوئی مہاجر واپس جانے کا اقدام کرے بھی تو وہ مندرجہ ذیل باتوں پر اپنی توجہ مرکوز کرے گا:

۱۔ اُسے اکھٹے ایک ہی جگہ سکونت دی جائے۔

۲۔ اُسے پانچ چھ مرلہ زمین بلا قیمت دی جائے۔

۳۔ اُسے مکان کی تعمیر کیلئے لکڑی، پتھر، اینٹ اور سیمنٹ نصف قیمت

پر دِیا جائے۔

۴۔ اُسے تین سال تک مالی امداد اور سرکار کی طرف سے ملتی رہے یا جب تک کہ اِسکو کوئی مستقل ذریعہ معاش میّسر نہ ہو۔

۵۔ اسکے تحفظ کیلئے مناسب انتظام کِیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ کم سے کم شرائط ہیں جِن کو قبول کرنے پر ہی کشمیری پنڈت مہاجر واپس کشمیر جانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کرے گا۔

JKNM نام کی ایک تنظیم نے نیا سری نگر تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی۔ افسوس کہ ریاستی سرکار کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ وہ اِس فارمولا کا مطالعہ اور اِس پر شد و مد سے سول سوسایٹی میں ایک بحث شروع کرے۔ مہاجرین کو واپس لینے کے نعرہ کی رٹ لگانا کچھ اور ہے ٹھوس، مثبت اور قابل عمل، فارمولا کو پیش کرنا اور پھر فریقین کو اِس پر رضامند کرنا الگ بات ہے۔ اسلئے لگتا ہے کہ اِن حالات کے پیشِ نظر کشمیری پنڈت آیندہ پچاس سال وہاں ہی پڑا رہیگا جہاں وہ پڑا ہوا ہے عرصہ پچیس سال سے۔ واپسی کی بحث بے معنی اور تضیع اوقات ہے۔



# کشمیر کے زمینی حالات اور مستقبل

کشمیر کے مُسلمانوں نے مذہب کو سیاست کے ساتھ اِسطرح ممزوج کِیا ہے کہ صدیوں تک اِن کا باہمی رابطہ گوشت اور ناخن کا رشتہ بنا رہے گا۔ اِس پر طرہ یہ کہ اب کشمیری مسلم مذہبی قیادت اور اسلامی تنصیبات اور تشکھلات پوری طرح سے عربستان کے کلچر سے جُڑ چکے ہیں۔ اِن سے حد اکثر تک اثر رسوخ قبول کِیا گیا ہے۔ اتنا ہی نہیں عرب اور اسلامی خلافت کے باہمی مناقشہ میں کشمیری مُسلمانوں نے خونخوار اور آدم کش اسلامی خلافت کا ساتھ دِیا ہے۔ اب کشمیر میں پاکستانی نہیں بلکہ ISIS کے جھنڈے پھیرائے جاتے ہیں۔ کھانا پینا، رسم وراہ، اندازِ گفتگو اور تکلّم کا وطیرہ سب عرب نواز بن چُکا ہے۔ اسلئے جو قوم اپنے اصیل تہذیبی ورثہ کو خیر باد کہکر غیر ملکی ثقافتی مظہرات کو اپنا لے تو اسکی شخصیت محکوم اور مغلوب بن کر رہتی ہے۔ ہندوستان سے الگ ہونے کی صورت میں کشمیر میں

پاکستانی کم اور عرب لوگوں کی بھرمار ہو گی۔ کشمیری مُسلم لڑکیاں بڑے چاو اور پوری رغبت سے عرب کے ساتھ شادی کرینگے اور اِس گمان میں رہینگے کہ مذہب کی بنا پر اُن کی قدر و منزلت ہوگی درصورتکہ حقیقت کچھ اور ہی ہو گی۔ اسطرح کشمیر کا معاشرہ دس بیس برس میں مکمل طور پر بدلاو اور غیر کشمیری ہو کر رہے گا۔ بے شک عرب سے روپیہ ضرور آئیگا اور عرفِ عام میں کشمیر پاکستان اور عرب کیلئے وہی ہو گا جو فلپاین اور تھائی لینڈ امریکنوں کیلئے بنا تھا یعنی جایِ عیش ولہو ولعب۔

اِس وقت کشمیر میں بہاریوں اور اُتر پردیش یا مدھیہ پردیش سے آنے والے مزدوروں کی بھرمار ہے۔ اب کوئی کشمیری کھیت میں یا سیب کے باغات میں محنت مشقت نہیں کرتا۔ انہی بہاریوں سے کام کرواتے ہیں۔ خود آرام طلب بن کر کاروں میں گھومتے رہتے ہیں۔ اِنکی مستورات کا اب گھر بار کے کام کاج سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ یا تو مردوں کی زینت یا اِنکی شہوت اور ہوسرائی کا مشغلہ رکھتی ہیں۔ جب پاکستان یا اسلامی اسٹیٹ بنے گی تو یہ مزدور واپس بہار چلے جائینگے اور کشمیریوں کے گھروں میں کام کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ پاکستانی اور عرب تو حکمران بن کر رہینگے اور اُن کو ہی اپنا نوکر بنائینگے۔ مذہب کا واسطہ دیکر یہ صورت حال لازمی طور ظہور پذیر ہو گی۔ اور پاکستان اوپر سے ایسا لبادہ ان پر لپیٹ لے گا کہ انہیں رونا تک بھول جائیگا۔ یہ حقیقت ہے محض دُشمنی یا عناد نہیں۔

# حصّہ دوم

# کشمیری پنڈت : ایک ذاتی تجزیہ

اِس تجزیہ میں میں سہو وخطا کا شکار بھی ہوسکتا ہوں۔ مجھے اِس بات کا بخوبی اندازہ ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ افکار جن پر میں نے بارہا غور وخوض کِیا ہے اپنے ہمفکر دوستوں اور حق پرست لوگوں کیلئے ضبط تحریر کروں۔

چودھویں صدی کے آغاز بلکہ تیرھویں صدی کے آخری نصف سے ہی کشمیر کی ہندو سلطنت میں شدید رخنہ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور تاریخ اِسکی شاہد ہے۔ کشمیر کی ہندو سلطنت کے زوال کا اصلی سبب تیرھویں صدی کے آغاز میں وسطی ایشیا میں چنگیز خان کی سرکردگی میں منگولوں کا عروج اور مشرقی ایشیا کے وسیع علاقے پر اُن کے اقتدار کا نمودار ہونا تھا۔ للتادتیہ کے بعد کشمیر کا کوئی بھی حکمران اِس قدر مقتدر اور قوی نہ تھا کہ وہ شمالی جنگاوروں کی حرص کا سدباب بنتا۔ ہاں

سلطان شہاب الدین نے کاشغر وغیرہ کی طرف فوج کشی کی تھی مگر وہ اِس قدر دھاک نہ بیٹھا سکا کہ ترکستانی جنگجو اور معرکہ آرا کمزور یا خوفزدہ بن کر بیٹھے رہتے۔

منگولوں نے شاہ راہ ابریشم یعنی Silk Road کو اپنے قبضہ میں لیا تجارتی کاروانوں پر ٹیکس لگایا۔ ٹیکس اور باج وخراج نہ دینے کی صورت میں انہیں لوٹنا اور ان کے مال ومتاع پر دست اندازی کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سارے تجارتی راستے جو کشمیر کی تجارت کیلئے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ مسدود ہوئے اور تجارت بند ہوگئی۔ اِسکا کشمیر کی معیشت پر بہت بُرا اثر پڑا اور راجاؤں کا خزانہ خالی ہوتا گیا۔ چنانچہ 1013 عیسوی میں جب محمود غزنوی کی لشکر نے پونچھ کے قریب ڈھیرہ ڈالا تو اُس وقت کشمیر کے راجا کے پاس اُسکا فوجی مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور وے ھند کے برہمن شاہی راجہ آنند پال نے کشمیر کے راجا کو مدد دینے کی پیش کش کی مگر محمود جلد ہی پونچھ سے کوچ کر گیا۔

ہندو دورِ حکومت کے آواخر میں ڈامر یعنی زمیندار طبقہ کے ہندو کافی با اثر اور متمول بن چکے تھے۔ طبقاتی نظام میں بڑی گہرائی آئی تھی اور اِس سے مملکت کا تانا بانا بکھر رہا تھا۔ عام کسان اور کاشتکار ایک طرح کی مضیق زندگی میں وارد ہوچُکا تھا۔ مالی بدحالی کے انجام میں اجتماعی طور بھی دہ باش اور کسان شدید مشکلات سے دو چار تھا۔ اِسکے علاوہ کٹر برہمنوں نے اُن

کے ساتھ لگ بھگ ترک موالات کا طریقہ اختیار کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ اِس معاشرے میں اِسلام نے اپنا پھیلاو بڑی سرعت اور مستعدی سے انجام دِیا۔ آج بھی ہم لفظ ''کارکُن'' سے آشنا ہیں۔ اور کارکُن وہی لوگ تھے جو حکومتی اداروں سے وابستہ تھے۔ معاشرے میں ان کا احترام تھا اِنہیں طرح طرح کی تسہیلات میّسر تھیں۔ ان کے باہمی ازدواجی رشتوں نے اِن کے طبقہ میں قرابت پیدا کی اور دوسروں کو اپنے نزدیک آنے نہ دیا۔ کشمیر میں 1339ء سے اسلام کے پھیلاو کیلئے ماحول سازگار بن چکا تھا اور اِسکے سازگار بنانے میں خود کشمیری پنڈتوں کا رول اہم اور فیصلہ کُن تھا۔

یہ دُرست ہے کہ اِسلام کو کشمیر یں پھیلانے کیلئے میر سید علی ہمدانی، میر محمد ہمدانی، سکندر بُت شکن اور اِسکے وزیر سہہ بھٹ اور شمس الدین اراکی کا رول بہت اہم رہا ہے۔ مندروں کو گرا کر مسجدوں مین تبدیل کرنا۔ استھاپنوں کو آستانوں میں بدلنا۔ لوگوں کو بزور شمشیر ترک دین پر مجبور کرنا اور ہندو مذہبی تنصیبات کو منہدم اور تہس نہس کرنا تو اِس عملداری کا ایک اہم عنصر رہا ہے جسکے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اِس سے قطع نظر خود پنڈتوں نے اپنے لئے بربادی اور تباہی کا سامان مہیا کیا۔ لازم تھا کہ حکومت اور اقتدار کھونے اور اکثریتی فرقہ کی ماہیت بدلنے کے بعد جب وہ ایک نہایت بدحال اقلیت میں بدل گئے تھے تو انہیں اس بدلی

ہوئی صورت حال پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے تھا اور اپنی آیندہ کی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈال کر درپیش مشکلات کے حل کیلئے کوئی لایحہ عمل طے کرنا چاہیے تھا۔ ایک زبردست سیاسی شعور کے اُبھرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ قوم رفتہ رفتہ کہنہ پرست بن کر رہ گئی۔ دقیانوسی دور کی بوسیدہ رسومات میں اُلجھ کر رہ گئی۔ رسومات کو آسان اور کم کرنے کے بجائے ان میں پیچیدگی اور طوالت کا اہتمام کیا اور اِس طرح اپنے آپ کو بجائے اِسکے کہ اپنے ہی وسایل پر منحصر رہیں دوسروں کے دست نگران بن کر رہ گئے۔ اِن کا سماج نہایت بوجھل اور غیر حقیقت پسند بن کر رہ گیا۔

وادیٔ ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جب سیاسی اقتدار ہندوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تو مسلمانوں نے پوری توجہ اسلامی مراکز پر مرکوز کی جو ایران اور عربستان میں تھے۔ ترک دین کی ماہیت کو اوایل کے ہندو اچھی طرح نہ سمجھ پائے اور جب سمجھ پائے تو وقت نکل چُکا تھا اور اِن کے بس میں نہیں تھا کہ وہ انسداد کر سکیں۔

1990ء میں پنڈتوں کے کشمیر سے انخلا کیلئے سب سے بڑی ذمہ داری حکوت ہند پر آتی ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ کشمیر کی مبینہ جمہوری حکومت

نام کی جمہوری اور سیکولر حکومت ہے۔ یہ دراصل اسلامی حکومت ہے جس نے سیکولرازم کا نقاب پہن رکھا ہے۔ اگر اِس بات کو مرکزی حکومت سمجھ نہ پائی تو وہ کوئی عاقبت اندیش حکومت نہ تھی۔ برعکس وہ بخوبی سمجھی تھی اور جان بوجھکر آنکھیں بند کرتی تھی۔ اُن کے پاس سراغ رسانی کا اتنا بڑا محکمہ ہے وہ لوگ کیا کر رہے تھے۔ دہلی کی سرکار جو کانگریس چلا رہی تھی وہاں کہ پرانے کشمیری پنڈت اقتدار میں تھے کیا اِن کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کشمیر میں اقلیتی فرقہ کا کیا حال ہے اور انہیں کِس عظیم خطرے کا سامنا ہے۔ مرکزی سرکار نے کیوں کشمیری ہندوؤں کے تحفظ کیلئے خصوصی قدم نہیں اُٹھائے۔ انہیں ہوشیار اور خبردار کیوں نہیں کِیا۔ کیا وہ ہندوستانی باشندے نہیں تھے۔ کیا اِن کا تحفظ ہندوستانی حکومت کا آئینی اور اخلاقی فرض نہیں تھا۔

جب ہم پرانی تاریخ کے اوراق کھول کر بار دیگر پڑھنا چاہتے ہیں تو ایک بات بار بار سامنے آتی ہے اور وہ ہے کانگریس پارٹی کا اصلی اور حقیقی حلیہ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ پارٹی تقسیم ہند کے بعد اور بھی مسلم نواز بن گئی۔ ہمیں اسکے مسلم نواز بننے کا کوئی دُکھ نہیں ہے۔ دُکھ یہ ہے کہ اگر کانگریس بقول ان کے اقلیت نواز پارٹی ہے تو ہم لوگ بھی کشمیر میں اقلیت میں تھے ہمارا تحفظ اُسی اقلیت نواز حقایق کے تحت کیوں نہیں ہُوا۔ یہ صورت حال ہمیں اِس بات کے کہنے پر مجبور کرتی ہے ہمیں یعنی کشمیری ہندوؤں کو ظلم وستم کا شکار بنانا کانگریس کی کشمیر پالیسی کا اصلی عنصر ہے۔ کانگریس کا نصب

العین یہ رہا ہے کہ نہ صرف کشمیر میں مسلمان اکثریت کا بول بالا رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اقلیتی کشمیری پنڈتوں کے فرقہ کے ساتھ امتیازی سلوک کر کے اُسے ہر طرح کی محرومیت اور مجبوری کا شکار بنایا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ گنے چُنے چند ایک کشمیری پنڈت دہلی کے حلقہ اقتدار میں اپنے لئے نہ کہ قوم کیلئے جگہ بنا چکے تھے۔1990ء میں جب ہمیں وطن چھوڑ کر مہاجر بننا پڑا ہم کانگریس کی حمایت کی اُمید لے کر جموں اور دہلی اور دوسرے شہروں میں نہیں آئے ہم اسلئے آئے کہ ہم ہندوستان کو اپنی تہذیب اور تمدن کا سرچشمہ خیال کرتے تھے۔ جسکے ساتھ ہمارا تہذیبی مذہبی اور لسانی رشتہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ جہاں ہم جان و مال اور عزت کے تحفظ کی اُمید رکھتے تھے۔

ہجرت کے بعد آج تک ستائیس سال گذر گئے ہیں۔ اور کانگریس برسر اقتدار رہی لیکن آج تک اِس حکومت نے نہ کوئی تحقیقاتی کمیشن بٹھایا کہ کیوں کشمیر میں مذہبی تعصب اِس قدر بڑھ گیا کہ مسلمان ہمیں اپنا جانی دُشمن خیال کرنے لگے اور ہمیں نہ صرف جان سے مار ڈالنے پر ہی اکتفا کرنا چاہتے تھے بلکہ ہمیں کشمیر سے جلاوطن کرنے کی سازش میں ملوث تھے۔ اور ہمیں نکال کر ہی دم لِیا۔ کانگریس پارٹی اور حکومت کا اس میں بہت عمل دخل رہا ہے۔ کشمیری مہاجرین کے کچھ خاندان دہلی یں پناہ گزین ہوئے۔ دہلی سرکار نے اُن سے اُن لوگوں کی فہرست طلب کی جنہوں نے

بی۔اے، بی۔ایڈ اور اِس سے بالاتر ڈگری تھی۔ لگ بھگ 230 ایسی کشمیری مہاجرین کی لڑکیوں کو محکمہ تعلیم دہلی سرکار میں ملازمت دی جو B.A, B.Ed. یعنی M.Ed. کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ لیکن ستم ظریفی دیکھئے انہیں صرف نصف تنخواہ طور اُجرت ملی، انہیں ایسی کوئی سہولیت میسر نہ تھی جو سرکاری ٹیچر کو مہیا ہوتی ہیں مثلاً نہ تو گریڈ کے مطابق تنخواہ ملی، نہ پینشن نہ گریچوٹی، نہ کِسی قسم کا وقفہ یعنی لیو۔ اِن سے پورا پورا کام لِیا جاتا تھا جو مستقل ٹیچروں سے بھی لِیا جاتا تھا۔ الیکشن کے موقعہ پر انہیں فرائض کی انجام دہی کیلئے انتخابی حلقوں میں بھیجا جاتا رہا لیکن تنخواہ آدھی سے بھی کم اور سالانہ ترقی سے بھی محروم۔ یہ سب معاملہ جب اِس وقت کی دہلی سرکار کی چیف منسٹر شیلا دکھشت کی نوٹس میں لایا گیا تو اسکا فرمان تھا کہ اگر اِن لوگوں کو وہ تمام سہولات اور حقوق مہیا کئے جائیں جو مستقل ملازموں یا ٹیچروں کو دی جاتی ہیں تو یہ لوگ واپس کشمیر میں نہیں جاینگے۔ اِس بوسیدہ اور دقیانوسی سوچ کا کیا کِیا جائے۔ کوئی شیلا دکھشت سے پوچھتا کہ کیا تمہاری کانگریسی سرکار نے کشمیر میں حالات کو عام اور پُرامن بنا دیا ہے کہ یہ لوگ واپس چلے جائیں۔ شیلا جیسی قیادت کے دوسرے ارکان بھی اسطرح کی بچگانہ اور احمقانہ سوچ رکھتے تھے۔ چنانچہ اِن 230 خواتین ٹیچرز کی کِسی نے دادرسائی نہیں کی کیونکہ اِن میں کوئی مسلمان ہوتی تو سب کا بھلا ہونا لازمی تھا۔ پچیس سال خدمات انجام دینے کے بعد یہ خواتین ٹیچر خالی

ہاتھ خالی جیب نوکری سے ریٹائیر ہو کر گھروں کو چلی جاتی ہیں اور باقی عمر بے چارگی اور انتہائی بے بسی میں بسر کر رہی ہیں۔ یہ ہے تحفہ ایک سیکولر اور نام نہاد اِنسان دوست حکومت کا حال جو اپنے کو جمہوری اور حق گذار بیان کرتی ہے۔

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کب کِسی کا گلہ کرے کوئی

پنڈتان کشمیر کو اب سمجھ میں آئی کہ دہلی کا سرکاری حلقہ اُن سے اِس بِنا پر نفرت کرتا ہے کہ وہ پڑھی لکھی قوم ہے۔ جو اپنی محنت سے پر آبرو طریقے پر روٹی کھانا چاہتی ہے۔ نفرت کی بنیاد نہایت غلط اور دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ کہتے ہیں کہ آزادی کے ساتھ ہی پنڈتوں نے ہندوستان کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یہ کج فہمی ہندوستانی قوم کے ہر طبقہ اور فرقہ میں بالعموم دیکھی جائیگی چاہے وہ کریلا مدراس سے ہو چاہیے کلکتہ یا بہار سے ہو۔ اِس کج فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے کانگرس میں گاندھی کی حمایت سے بیش از حد اثر رسوخ پیدا کِیا تھا۔ کانگریسی نیتاوں میں گاندھی کا احترام حماقت کی حد تک پہنچ گیا تھا اور اِسکے گفتار اور کردار کو الہام سمجھ کر تکریم و تعظیم کرنے لگے۔ اسلیئے چونکہ نہرو گاندھی کا باہمی رشتہ تقدس کی سطح کا جیسا بنایا جا چکا تھا اسلیئے کوئی بھی کانگریس مجلس عمل میں نہرو کی مخالفت نہیں کر سکا۔ اور اگرچہ ۱۲ مجلس عمل میں سے ۱۱ نے پٹیل کو ووٹ دِیا کہ وہی

وزیراعظم بننا چاہیے اور صرف ایک ووٹ نہرو کو ملا۔ اس پر گاندھی نے پٹیل سے نہرو کے حق میں دست بردار ہونے کو کہا اور ایسا ہی ہوا دیکھئے گاندھی نے جمہوریت کی اسطرح دھجیاں اُڑادیں اور اپنے چہیتے شخص کو وزیراعظم بنا دیا بغیر یہ سوچے کہ آیا وہ اِس عہدہ جلیل پر فائیز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے کہ نہیں۔ میرے خیال میں یہ فیصلہ ٹھیک نہیں تھا۔ کبھی بھی نہرو جیسے نیم حکیم کو وزیراعظم نہیں بنایا جانا تا چاہے تھا۔ یہ قوم کا المیہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اِس نے نہرو کی حمایت جذبات میں آکر کی نہ کہ واقع بینی realism کا ثبوت دِیا۔

نہرو نے وزیراعظم کی حیثیت سے کون کون واجب مذمت کام کیئے میں اِسکا ذِکر یہاں نہیں چھیڑونگا اگرچہ وہ بجائے خود ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز مباحثہ ہے۔ میں صرف اِس بات پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں کہ نہرو کو ہم کشمیری پنڈتوں نے وزیراعظم نہیں بنایا۔ اور اِسکے بعد وہ الہ آباد جون پور حلقہ انتخاب سے انتخاب لڑتا رہا اور ہمیشہ کامیاب ہوتا رہا۔ جون پور کا حلقہ انتخاب کوئی پنڈتان کی اکثریت کا حلقہ انتخاب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی پنڈت گھرانا وہاں بسکین ہے۔ پھر ہم پر یہ الزام کیوں وارد کیا جاتا ہے کہ تم یعنی پنڈتاں ہندوستان کی حکومت میں سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ اور پھر اِس بنا پر ہمارے ساتھ عناد رکھنا تو تعصب کی حد ہے۔

پنڈت نہرو کا ہم کشمیری پنڈتوں کے ساتھ کیا سلوک رہا ہے اِسکی

ایک چھوٹی مِثال دیتا ہوں۔49-1948ء کا زمانہ تھا۔ سر تیج بہادر سپرو نے 1947 میں کشمیر پر قبایلی حملے کے نتیجہ میں یہ رائے بنائی تھی کہ پنڈتوں کو کشمیر سے نکالا جائے اور ہندوستان میں کِسی اور مقام پر پورے کشمیری پنڈت سماج کو پھر سے بسایا جائے۔ اس منصوبہ کیلئے تیج بہادُر سپرو نے تین کروڑ روپے کی رقم مختص کی تھی اور یہ منصوبہ نہرو کو دِیا تھا۔ لیکن نہرو نے اِس پر کوئی غور نہیں کِیا۔

بہرحال، دہلی میں وزیراعظم نہرو کے پرنسل سکریٹری دوارکا ناتھ کاچرو کو الہ آباد کے سپرو کے گھر سے ٹیلی فون آیا کہ تیج بہادُر سپرو کی حالت بے انتہا نازک ہے اور ہر لمحہ ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ کاچرو نے نہرو کو مطلع کِیا اور نہرو نے کہا کہ جہاز کا انتظام کرو الہ آباد عیادت کیلئے سپرو کے ہاں جائینگے۔ چار بجے کے قریب نہرو کاچرو کو لے کر الہٰ آباد سپرو کی عیادت کو پہنچا اور سپرو جو بستر مرگ پر پڑا تھا Coma کی حالت کبھی ہوش اور کبھی بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ ذرا ہوش آیا تو دیکھا نہرو ہے۔ تو بولا جواہر تُم آگئے۔ اچھا۔ کشمیری پنڈتوں کے بارے میں کیا کِیا۔ نہرو نے کچھ نہ بولا اور سپرو پھر بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔ عیادت ہو چکی اور نہرو واپس کار میں بیٹھ کر الہ آباد کے ہوائی اڈہ کی طرف جا رہا تھا۔ کاچرو بھی کار میں بیٹھا تھا۔ کار ہوائی اڈہ کی طرف جا رہی تھی تو اچانک نہرو نے کاچرو سے مخاطب ہو کر کہا "کاچرو تُم نے دیکھا۔ یہ بوڑھا نصف قبر میں پہنچ گیا ہے

اور پھر بھی کشمیری پنڈتوں کی بات کر رہا ہے گویا مجھے کشمیری پنڈتوں کے علاوہ اور کوئی دوسرا کام نہیں۔"

یہ کہانی میں نے اسلئے بیان کی کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ نہرو کشمیری پنڈتوں کے بارے میں کس انداز سے سوچا کرتا تھا اگرچہ وہ اِسی کشمیری پنڈت قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اِس پر فخر بھی کرتا تھا۔

میں اپنے مطمح نظر سے دور نکل گیا ہوں اور واپس اُس طرف رجوع کرتا ہوں میں یہ بات بڑے دُکھ اور افسوس سے رقم کرنا چاہتا ہوں کہ کشمیری پنڈتان نے 1990ء کی مجموعی مہاجرت کا نہ تو تاریخی پس منظر میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور نہ اِس سے حاصل ہونے والے کئی سبق سیکھ لئے۔ اِس بات کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اگر کشمیری پنڈتوں نے تاریخ کا کتابی مطالعہ نہیں کیا تاہم وہ تاریخ کا ایک حصہ خود ہیں۔ تاریخ اِن کی آنکھوں کے سامنے بنتی جا رہی تھی اور اِس تاریخ کا اہم ترین عنصر خود پنڈت تھے۔ انہیں کیا اتنا سمجھ نہیں آیا کہ کِس طرح انہیں صفحہ روزگار سے بطور ایک تاریخی فرقہ کے محو کِیا جا رہا ہے اور اسکے باوجود اِن میں وہ خصائیل برقرار رہیں جو انہوں نے اٹھ سو سال کی غلامانہ زندگی کے دوران حالات کی گراں باری کی وجہ سے اپنایا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اٹھ سو سال تک ایک جاہل اور مذہب زدہ متعصب سنی اکثریتی فرقہ کے زیر فشار رہ کر اُنہیں زندہ رہنے کی خاطر کون کون سے حربے استعمال کرنے

پڑے کیونکہ مجبوری اور لاچارگی کا عالم تھا۔ اُن میں کئی ضرر رسان خصایل رس بس گئے۔ اِس پر بحث مطلوب نہیں۔ لیکن جب 1990ء میں جلاء وطنی ہوئی اور واپسی کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی اور ساتھ ساتھ پنڈتوں نے مال، جایداد، مکان، زمین، باغ، دوکان اور تمام اثاثہ کھو دیا اور برہنہ پا برہنہ سر دیارِ غیر میں پناہ گزین بن کر آئے تو لازم تھا کہ اپنی خصلت کے بُرے عناصر کو بھی بانہال کے اِس طرف پھینک آتے اور جلائے وطنی میں ایک نئی سوچ، نئی اپروچ، نیا دماغ اور نئی اُمنگ پیدا کرتے جیسے کہ زندہ قوموں کا کرنا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وطن سے لگاو اور مادر وطن سے جدائی ایک ناقابلِ تلافی المیہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ترک وطن کے سالہا سال تک بلکہ آج بھی ہمارے دانشور کشمیر کی یاد لے کر اسکے مرثیہ گاتے ہیں ایسا ہونا فطری ہے اور مجھے اس پر کوئی غیر معمول ردعمل کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرا المیہ کچھ اور ہے۔ میرا المیہ یہ ہے کہ کب تک ہم ماتم اور مرثیہ کرتے رہیں گے۔ کب تک ہم وطن کے کھو جانے کا رونا روئیں۔ ستائیس برس ہوئے دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہندوستان کے حالات، تاریخ، سیاست اور معیشت نے کتنا بڑا پلڑا بدل دیا لیکن ہم ابھی تک کشمیر کی یاد میں سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ سیاستدانوں کے جھوٹے اور مکارانہ وعدوں پر یقین کر رہے ہیں۔ اِن کے زلہ بردار اور کاسہ لیس بن کر رہ گئے ہیں۔ آگے کے پچاس، سو، دوسو، اور ہزاروں سال تک ہماری نظر

جا نہیں رہی ہے۔ آئے دِن کشمیر واپس جانے کی کھوکھلی، نعرہ بازی سے اپنے کو اور دوسروں کو بھی گُمراہ کر رہے ہیں۔ کبھی Twin City اور کبھی Homeland کبھی Panun Kashmir اور کبھی کشیپ دیش، کبھی Cluster اور کبھی اپنے اپنے گاؤں واپس جانے کی داستان امیر حمزہ کھول دیتے ہیں۔ تاریخ سے منہ موڑ کر شترمرغ کی طرح ریت میں سر دیکر سوچتے ہیں کوئی ہمیں نہیں دیکھتا۔

چنانچہ کشمیری پنڈت ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی صورت حال سے دُو چار ہیں۔ ایک طرف تو کشمیر کے زمینی، سِیاسی، سماجی، تمدنی حالات اِتنے بدل گئے کہ پنڈتوں کی باز آبادکاری عوام اُلناس میں مُمکِن نہیں۔ اِسی وجہ سے اِنٹرلکیوٹرس نے بھی اپنی حتمی رِپورٹ میں باقی سُفارِشات کے علاوہ پنڈتوں کے لئے Concentrated جگہ پر بسانے کی سُفارِش کی تھی۔ یہ رِپورٹ UPA 2nd کی حکومت کو قریباً پانچ سال پہلے سُپرد کی تھی۔ اِس تنظیم نے پنڈتوں کے لئے Internally Displaced People کا Status دینے کی سُفارِش بھی کی تھی۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مُطابق بھی کشمیری پنڈت مہاجر نہیں ہیں۔ بلکہ Internally Displaced برادری ہے۔

پنڈتوں نے منجملہ طور پر بھی رِیاستی اور مرکزی سرکار کو بارہا عرضداشت پیش کیں۔ مگر ''جہان بجنبد نہ جمبد گُل محمدؐ'' کے مصداق

حکومتوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

دوسری جانب عرب ممالک سے حوالہ رقومات کشمیر میں جوان نسل کو کٹر پنتھ ڈھانچہ اُستوار کرنے کے لئے بھیجے جا رہے ہیں۔ اِسطرح سے ایک نیا مکتب فکرِ کشمیر میں پنپ رہا ہے۔ اور بڑے حصے کو متاثر کِیا ہے۔ یہ رقومات مُسلسل اور مُتواتر درآمد ہو رہے ہیں اور نئی مساجد، درس گاہیں، سٹیڈی سرکل قائم کئے جا رہے ہیں۔ سکیورٹی ایجنسی سے بچنے کے لئے اور راز افشا نہ ہونے کے لئے رقومات درجہ بہ درجہ اندک اندک مقدار میں بھیجے جا رہی ہیں۔ حال کی مقامی دہشت گردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو ہوش رُبا ہے۔ ترال، یاری پورہ، بٹہ پورہ، جنوبی کشمیر کے علاقوں میں اضافہ مشاہدے میں آیا ہے۔ 2015ء میں کوئی بیاسی (82) لڑکے دہشت گردی میں شامل ہو چکے ہیں۔ اِن حالات میں کشمیری پنڈتوں کو نہ تو Concentrated جگہ پر بسایا گیا اور نہ ہی کوئی ایسی صورت حال تیئس سال کی طویل مُدت کے بعد بھی نظر آتی ہے۔ اِس لئے یہ کہنا واجب ہے کہ کشمیری پنڈتوں کو دار پر چڑھانے کے لئے ''رسن'' تیار کِیا جا رہا ہے۔

میں کِس طرح برادری کے دانشوروں اور غیر دانشوروں غرضیکہ سبھی لوگوں کو سمجھاوں کہ ہم ایک طوفان عظیم سے نبرد آزما ہوئے ہیں۔ اسلامی استبداد کا پرچم چار دانگ عالم یں بلند کِیا جا رہا ہے۔ ہمیں کیا کسی بھی ملک کو اِس طوفان سے مقابلہ آرائی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ دُنیا

کے ایک ارب سے بھی زیادہ مسلمانوں نے اسلام کا علم بُلند کیا ہے۔ دُنیا کا کون سا ملک ہے جہاں اُن کا بول بالا نہیں۔ روس کا اتنا عظیم جنگی ساز و سامان دھرے کا دھرا رہا اور روس ٹوٹ گیا۔ امریکہ نے افغانستان میں کون سا حربہ باقی چھوڑا لیکن پا برہنہ سر برہنہ پٹھانوں کے سامنے ایک بھی نہ چلی۔ ہندوستان پچیس سال سے پاکستانی مجاہدوں کے ہاتھوں ضرب و حرب میں اُلجھا ہُوا ہے کشمیر میں نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی صورت ہے۔ انڈونیشا کو جو ایک مُسلم ملک ہے اس پاداش میں کہ وہاں لوگ قدیم ہندی رسم و رواج سے کلیتاً الگ نہیں ہوئے اسلامیوں کے حملوں کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔ کشمیری مسلمان کی سیاست بہت سادہ سی ہے۔ پاکستان سے ہتھیار لو اور ہندوستان کو دکھا کر ان سے رقومات بوریاں بھر بھر کر لو۔

یہ ہے بین الاقوامی تناظُر اسلام گری کا اور پنڈت ہے کہ واپس کشمیر جانے کی احمقانہ سوچ میں پڑا ہے۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ دہلی اور کشمیر کے سیاست دان دانستہ اِسکو واپس جانے کے بھرم اور مخمصہ میں اُلجھا رہے ہیں تا کہ وہ مسئلہ کے بُنیادی عناصر کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ ابھی تک کشمیری پنڈت نہ سمجھ سکا کہ کانگریس پارٹی مسلم لیگ کا دوسرا نام ہے۔ اور بھارتیہ جنتا پارٹی گنتی کے چند ہندو سرمایہ داروں کی ٹولی ہے جس نے سیاست اور دائیں بازو کی سیاست کا چولا Mask پہن رکھا ہے۔ انہیں پنڈتوں سے نفرت ہے۔ کوئی بھی پارٹی کشمیری پنڈتوں کو واپس لے کر

بسانے کا ارادہ نہیں رکھتی کیونکہ کوئی بھی پارٹی کشمیر اور ہندوستان کی مسلم اکثریت کو اپنے سے ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ ہمارا پتاؔ گاندھی جی نے 1932ء میں ہی یہ کہہ کر کاٹا تھا کہ کشمیر مسلمان اکثریت کا دیش ہے اور ان کا ہی بول بالا ہوگا۔ اسکے بعد رہی سہی کسر نہرو مہاراج نے 1946ء میں سری نگر کے جلسہ میں نکالی اور کہا کہ پنڈتوں کیلئے صرف تین راستے ہیں۔ رئلو، ژلو یا گلو یعنی مل جاؤ، بھاگو یا ختم ہو جاؤ۔ تینوں باتیں ہو گئیں۔ جو دو تین ہزار لوگ کشمیر میں رہ گئے وہ مجبوراً مسلمانوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ اکثر بھاگ گئے ہیں اور بہت سارے ختم ہو گئے۔ نہرو کی روح کو عالم ما فیہا میں بہت سکون ملا ہوگا۔ اِس نہتی، بے قصور اور بے یار و مددگار قوم پر ظلم و ستم ڈھانے کے پاداش میں اُس نے اپنے خاندان کے تین چشم و چراغ کھو دئے۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ شری جگموہن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اُس نے راجیو گاندھی سے کہا تھا کہ دنیاوی طاقت سے بڑھ کر ایک سماوی طاقت ہوتی ہے۔

دِل سے جو بات نکلتی اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے



# کشمیری پنڈتوں کی شناخت کا تحفظ

شناخت کے لفظی معنی ہیں پہچان۔ ایک آدمی کو اسکے نام سے جانا جاتا ہے کہ یہ شخص فلان شخص کا بیٹا یا بیٹی اور فلاں گھر سے وابستہ ہے۔ یہ اسکی ظاہری پہنچان ہے۔ لیکن ہر فرد کی باطنی پہچان بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ باطنی پہچانی میں کئی باتیں آتی ہیں جو اسکی شخصیت، ذہنیت، تاریخی اور ثقافتی پس منظر، اسکی معاشرت اور اُسکا تاریخی سابقہ وغیرہ جیسی غیر مرئی باتوں کا خلاصہ کرتی ہیں۔ کشمیری پنڈت ایک تاریخی اور تمدنی اکائی کی نشاندہی کرتے ہیں جنہوں نے ایک مخصوص جغرافیائی منطقہ میں جنم لیا۔ کارنامے کیئے اور اپنے پیچھے باقیات چھوڑ کر چلے گئے۔

شناخت کا تحفظ جسمانی تحفظ سے جُداگانہ ہے۔ پہلے تو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ پنڈتوں کی شناخت کو کس طرح کا خطرہ لاحق ہوا ہے جسکے لئے تحفظ لازمی ہے۔ خطرہ کیونکر پیدا ہوا۔ اسکے محرک کون ہیں۔ اِنکی

غرض و غایت کیا ہے اور وہ کس حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ ایک ایسی قوم جسکی تاریخ پانچ ہزار سال پُرانی ہو جس نے ایک سلطنت کی تشکیل دیکر اسکو ہزاروں سال تک ایک مقتدر اور بارسوخ حکومت دی جسکی قلمرو چاروں طرف وسیع جغرافیائی علاقہ کا احاطہ کرتی تھی اور جس نے مخصوص تمدنی ڈھانچہ قائم کیا، اِسکو اپنی مادرِ وطن سے نکال باہر کرنا اور پھر طرح طرح کے بہتانات تراشنا تاریخ کا ایک افسوسناک اور شرمناک المیہ ہے۔

کشمیری پنڈتوں کا کشمیر سے انخلا امر حقیقت ایک پانچ ہزار سال پُرانی تہذیب کا انخلا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ آج سے لگ بھگ 677 سال پہلے جب کشمیر پر اسلامی حکمرانوں کا تسلط ہوا اور اسکے ساتھ ہی ایک بہت وسیع اور معاشرتی تحریک کا آغاز ہوا جسکا مُدعا یہ تھا کہ کشمیر کی پانچ ہزار سال قدیم ثقافت کو بدل کر ایک غیر ملکی یعنی عربستانی ثقافت میں رنگا جائے اور اسکے لوازمات کو بزور بازو روبعمل لایا جائے تو لازمی تھا کہ پورا معاشرہ ایک نئی تہذیب سے جوڑا جا رہا تھا جسکی بنیاد نہ ہندو تمدن میں تھی اور نہ ہندوستانی تہذیب میں تھی۔ یہ کہ عرب اور ایران کی غیر ہم آہنگ تہذیب میں تھی۔ دین اسلام کو کشمیر میں لانے والے نہ تو اسلامیوں کی جرار لشکریں تھیں اور نہ انکے دلاور کماندار تھے جیسے کہ فتح ایران یا فتح یورپ میں تھے۔ بلکہ اسلامیوں نے دین اسلام کے مبلغوں کی وساطت سے اسلامی تعلیم کو

کشمیر میں لاکر گھر گھر پھیلایا۔ ان عزایم کی تکمیل کیلئے اسلامیوں نے تبلیغ اور تلوار کا دھرا حربہ اختیار کیا۔ تبلیغ کیلئے توران اور ایران کے مشائخ آئے اور تلوار اُٹھانے کیلئے مقامی جنگ بازوں کو کام پر لگایا۔ یہ جنگجو طبقہ اُن کشمیری نو مسلمانوں کا تھا جو معمولی اور حقیر مفادات کے حصول کی خاطر اپنے غیر وطنی اور غیر مذہبی ہدایت کاروں کے ایما پر اپنے کو صوفی اور درویش کا لقب دیکر لوگوں کو زور و جبر سے ترک دین پر مجبور کرتے اور پھر سبز علم اٹھا کر لوگوں کا جم غفر لے کر ایک سے دوسرے گاؤں جا کر تبلیغ کرتے لوگوں کو خوفزدہ بنا کر اسلام قبول کرنے کو کہتے۔ گاؤں کے مندر کے بُت توڑ کر مندر کی عمارت کو مسمار کرتے اور مندر کے پجاری کو مسلمان بنا کر ختنہ کر کے امام مسجد بناتے۔ اسطرح کشمیر میں اسلام کا پھیلاو چند ہی برسوں میں ہوا چونکہ حکومت بھی اسلامیوں کی تھی تو مقتدر نو مسلمانوں کو اوقات کا ہرتا کرتا بنا دیا جتنی بھی زمینیں اور جائیدادیں مندروں اور دیوی ستھانوں سے منسلک تھیں سب اوقاف اسلامی کے دائیرے میں آگئیں۔

یہ سب کچھ بالآخر اس بات پر منتج ہوا کہ پنڈتوں کی شناخت تاریخ کے اوراق سے جک ہوتی گئی۔ پنڈت سمٹ کر اپنی ذات ایسے گھرانے یا چند رشتہ داروں تک رہ گیا۔ اس دایرے سے باہر نہ تو اسکو تحفظ کا یقین تھا اور نہ یہ اعتماد تھا کہ وہ پھر سے ایک وسیع معاشرتی تنظیم کا فرد ہوگا۔

بندگی میں گھُٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب

اور آزادی میں بحرِ بیکران ہے زندگی

جو سمندر کسی زمانے میں متلاطم اور موج خیز تھا، جسکا پانی ٹھاٹھیں مار کر جاہ و جلال، عظمت اور استقلال کا مظہر تھا وہ سمندر سمٹ کر ایک پُر عضونت جوہڑ بن کر رہ گیا۔ چھ سو سال کے طویل عرصے تک اقلیتی پنڈت قوم نے غلامی کے طواق کو اٹھائے رکھا۔ ہر پہلو سے اس کی بے عزتی ہوتی رہی۔ وہ اپنے خول میں ایک کرم ابریشم کی طرح الجھ کر رہ گیا۔ جب اُسے سماج کی اکثریت کی طرف سے طرح طرح کی عقوبت سہنی پڑی تو وہ اپنے اندر ہی سمٹ کر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ستر سال کی آزادی کے بعد کشمیری پنڈت تنہا پرستی اور یگانہ خوئی بنا پر الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہے۔ اِسے سماجی زندگی کے کھُلی ہوا میں رہنے کا موقعہ نہیں مِلا۔

ترک وطن کئے ہوئے 26 برس ہونے کو ہیں۔ پنڈت مہاجر ہندوستان کے مختلف شہروں میں محنت اور مشقت کر کے نان و نفق حاصل کرتے ہیں۔ پہلے تو سماجی تانا بکھر گیا۔ مندر اور دیوی استھاپن جو ان کو آپس میں جوڑے رکھے تھے نیست نابود ہو گئے۔ 27 سال کی عمر سے کم نوجوانوں کی مادری زبان یعنی کشمیری نابود ہو گئی۔ سماجی اور اپنی رسومات جو ذہنی طور پر ایک فرقہ کی بقا کا باعث ہوتے ہیں رفتہ رفتہ کالعدم ہو گئے۔ سنسکرت زبان ہمارے تمدن اور تہذیب کی کلید ہے وہ ہمارے ہاتھ میں نہ

رہی۔ سائنسدانوں نے اِسے ہماری زندگی سے نکال کر پھینک دیا۔ معاش زندگی کی تلاش میں ہم ثقافت کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ حکومت ظاہر طور ہماری بے سرو سامانی اور سر گردانی پر اِظہار ہمدردی کرتی تھی لیکن باطن میں خوش تھی کہ کشمیر ہمارے وجود سے خالی ہوا۔ ہمارے ثقافتی اور تمدنی وجود سے خالی ہوا۔

اب کشمیر میں نہ کشمیریت رہی نہ ہندوستانیت اور نہ ہی پاکستانیت۔ اب کشمیر میں عربیت ہے وہاں وہابیت اور سلفیت ہے۔ کشمیریوں کا باوا آدم عرب پرست بن گیا۔ عربی لباس، عربی برقعہ، عربی داڑھی، عربی انداز، موالات، عربی علیک سلیک، گویا کشمیری اب سعودی عرب کی ایک خود ساختہ نو آبادی بن چکی ہے۔ کشمیریوں نے اسلام کے آنے کے بعد ہر دور میں بیرونی طاقتوں کو دعوت دیکر اپنے اوپر حکومت کرنے پر اُکسایا۔ چنانچہ اپنے کو دوسروں کا غلام بنانے میں وہ یدطولیٰ رکھتے ہیں اور اس کام میں کوئی دوسرا ان کا ہمتا نہیں ہوسکتا۔ عربستانیت اِسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

اس طوفان بے تمیزی میں کشمیری پنڈت اپنی شخصیت، اپنی کلچر، اپنی تاریخ اور اپنی زندگی کے وطیرہ کو کیسے برقرار رکھ سکتا ہے۔ ہندوستان ایک موج خیز قلزم بے پایان ہے۔ وہ اس وسیع اور عمیق اوقیانوس میں کونکر اپنی اِنفرادیت اپنی شخصیت کو قائم رکھ سکتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس ہے۔

تاریخ عالم میں بعض اقوام کے آوارہ گرد ہونے کی داستانیں درج ہیں۔اُن اقوام کی مختلف وجوہات کی بنا پر دشت و بیابان نوردی ہوتی رہی۔ بطور کلی یہ قومیں اسلیئے ترک وطن پر مجبور ہوگئیں کیونکہ دوسری قوم کی بالادستی کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔لیکن کشمیری پنڈت حیران اور انگشت بدندان ہے کہ جب ہندوستان غیروں کے قبضہ میں تھا اور جب کشمیر مسلمانوں کے زیرنگین تھا اُس وقت اُسکی پوری قوم کو ترک وطن کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ لیکن 1990ء میں ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو چکا تھا اور اِسکا آئین ہندوستانی شہری کو جان اور مال کے تحفظ کا ضامن تھا لیکن پھر بھی کشمیر کی ہندو آبادی کو اپنے گھروں سے نکالا گیا۔

سوال اُٹھتا ہے کہ کیا ہندوستان کی جمہوریت اور اسکا سیکولرازم حقیقت میں ہندوستانی شہریوں کو تحفظ فراہم کرسکتا ہے؟ کشمیری پنڈت اس سوال کا جواب چاہتے ہیں؟



# حصّہ سیوم

# عُمر عبداللہ مخلوط سرکار کی سراسیمگی

2008ء میں عُمر عبداللہ کی سربراہی میں کانگریس نیشنل کانفرنس مخلوط سرکار کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وادی میں علیحدگی پسندوں کے ایما پر رائے دہندگان نے انتخابات کا بائیکاٹ کِیا۔ اگرچہ شہروں اور مضافات میں اِس کا اثر ضرور پڑا۔ لیکن دہاتی علاقوں میں نسبتاً اِسکا اثر کم رہا۔ گویا یہ سرکار نمایندہ سرکار نہیں تھی۔ اِس وجہ سے وزرا اور ممبران قانون سازیہ میں احساس کمتری دِکھائی دیتا تھا۔ مگر اِقتدار کی ہوس میں غرق اِن وُزرا اور اُن کے ساتھیوں نے خزانہ عامرہ کو دو دو ہاتھ سے لوٹا۔ اور نئے عالیشان محلات اور جائیدادیں بنانے میں لگے رہے۔ ووٹ بائیکاٹ پر ایک طائیرانہ نظر ڈالنے کے لئے مشتے از خروارے چند انتخابی حلقوں کی تفصیل نظر نواز ہو۔

(۱) امیرا کدل، ناصِر اسلم وانی 3922 ووٹ حاصل کر کے کامیاب

اُمیدوار قرار دئے گئے۔ کُل ووٹ 11274 ڈالے گئے تھے۔
36% ووٹ حاصل کئے۔

(۲) سوپور: اشرف گنائی 4368 ووٹ حاصل کر کے کامیاب قرار دئے گئے۔ جبکہ کُل ووٹ 18017 ڈالے گئے تھے۔

(۳) لنگیٹ: عبدالرشید شیخ 7964 ووٹ حاصل کر کے کامیاب قرار دئے گئے جبکہ 36429 کُل ووٹ ڈالے گئے تھے۔ گویا 21 فیصدی ووٹ حاصل کئے۔

(۴) کپواڑہ: میر سیف اللہ۔ 16695 ووٹ حاصل کر کے کامیاب قرار دیئے گئے۔ جبکہ کُل ووٹ 55525 یعنی 21 فیصدی ووٹ حاصل کئے۔

(۵) درہال۔ 19399 ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوئے جبکہ کُل ووٹ 67952 یعنی کُل 28 فیصدی ووٹ حاصل کئے۔

(۶) وِجے پور: سُرجیت سنگھ سلاتھیا۔ 21090 ووٹ حاصل کئے جبکہ کُل ووٹ 77515 تھے گویا 22 فیصدی ووٹ حاصل کئے۔

(۷) سنگرامہ: بشارت بُخاری۔ 27609 ووٹوں میں سے 7812 ووٹ حاصل کئے۔ گویا 28 فیصدی ووٹ مِلے۔

(۸) بیروہ۔ محمد شفیع۔ 47992 ووٹوں میں سے 11720 حاصل کئے۔ گویا 24% ووٹ حاصل کئے۔

(۹) بانڈی پوری: 49995 ڈالے گئے ووٹوں میں سے 1305 ووٹ حاصل کئے۔ یعنی 6% ووٹوں پر نمایندگی مِلی۔

(۱۰) راجوری۔ شبیر احمد خان۔ 13% ڈالے گئے ووٹوں پر اسمبلی کی نمایندگی حاصل کی۔ 10,013 ووٹ حاصل کئے جبکہ کُل 73469 ووٹ تھے۔

جب بھی کشمیری پنڈتوں کی بازآبادکاری کا مسئلہ اُٹھایا جاتا ہے تو مخلوط سرکار غیر ضروری سوالات زیر بحث لاتی ہے اور اِس فرقے کی بازآبادکاری کو مشروط بنا کر ریاست جموں و کشمیر کا حلیہ اور جغرافیہ بدلنے کا کھُلے بندوں اظہار کرتی ہے۔

یہ مخلوط سرکار آزادی کے بعد سب سے نِکمی، نااہل، راشی اور ہر سطح پر نااہل ثابت ہوئی۔ خود عمر عبداللہ بچگانہ تماشے کرتا رہا۔ اِس وجہ سے بھی وزراء اُسکو خاطرِ میں ہی نہیں لاتے تھے۔ اِنتظامیہ نہایت کمزور اور بے اثر رہا۔ ریاست کے عوام خدا بھروسے پر ہی چلتے رہے۔ کُچھ شرمناک سیکنڈل رونُما ہوئے۔ جس سے رونگھٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر بورڈ آف سکول ایجوکیشن کا شرمناک سیکنڈل نظر نواز ہو۔ محمد سعید تعلیم کے وزیر نے اپنی دوسری بیوی کے پہلے خاوند کے لڑکے کے لئے میٹرک اور اُسکے بعد بارہویں جماعت کے سالانہ اِمتحانات میں خاص امتیاز حاصل کرنے کے لئے بورڈ اور محکمہ تعلیم کے اساتذہ کو نقل اور جوابی پرچے لکھنے کے لئے

لگا دِیا۔ یہاں تک کہ بورڈ کے اُس وقت کے چیرمین کو بھی اِس کام میں ملوث کِیا گیا۔ بشیر احمد جو بورڈ کے اُس وقت کے چیرمین تھے۔ کالج ڈپارٹمنٹ سے ڈپوٹیشن پر بورڈ میں تعینات کئے گئے۔ ڈپوٹیشن میں مزید توسیع کر کے اُسکو بورڈ میں ہی تعینات رکھا گیا۔ وزیرِ اعلیٰ نے شور وغُل بپا ہونے پر بھی اِنتظامیہ کے اعتراض پر غور نہیں کِیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سونیا گاندھی UPA چیر پرسن کی مُداخلت ہُوئی پر مجرم وزیر کے خلاف نادیبی کاروائی نہیں کی گئی۔ اور نہ ہی کُنبہ پروری کے خلاف عوامی نُمایندہ گی کا دِفاع کِیا گیا۔ بلکہ وزیرِ اعلیٰ نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کِیا اور مسئلے پر چُپ سادھ لِیا۔ اِس سے مجرموں کے حوصلے بُلند ہوئے اور نتیجے کے طور پر سوالاتی پرچوں کا Leakage جوابی کاپیوں کی گُم شدگی کے متعدد معاملات عوام الناس اور سرکار کی نوٹس میں لائے گئے۔ بورڈ آف پروفیشنل اِمتحانات میں بھی سن سنی خیز واقعہ رونُما ہُوئے جن میں دو وزراء کے لواحقین مُلوث پائے گئے۔ یعنی وزراء کے بچوں کے بدلے دوسرے ہی اُمیدوار میڈیکل انٹرنس ٹیسٹ میں شامل ہو رہے تھے۔ چھاپے ڈالے گئے۔ معاملے کو صحیح پایا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ بورڈ آف پروفیشنل ایگزمنیشن کا ایک اور سکنڈل منظرِ عام پر آیا یعنی خاص خاص اُمیدواروں کے لئے الگ امتحانی مرکز قائم کِیا گیا تھا۔ جس سے یہ اُمیدوار چور دروازے سے میڈیکل سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ یہ سارے واقعات عمر عبداللہ کے

دورِ اِقتدار میں رُونما ہوئے۔ اِس حکومت کی کارکردگی کا اندازہ اِس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 2012ء سے بورڈ آف سکول ایجوکیشن کے چیرمین کی تقرری عمل میں نہ لا سکے۔

اِس حکومت کا ایک اور پہلو اِسکی کی عوام دُشمنی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ وزراء کے خلاف سرکاری زمین ہڑپنے کا ایک بڑا اسیکنڈل طشت از بام ہُوا۔ جس میں چودھری محمد رمضان Consumer and Public Distribution کا قلمدان سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڈگام میں ہمہامہ ایئرپورٹ روڑ پر کاہچرائی اور آبادی دِہ پر جابیرانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ اور اُس کو اپنی ملکیت بنا چُکا تھا۔ پٹوار ریکارڈ میں اِس سلسلے میں مُناسب کاروائی بھی کروائی۔ اِدھر پبلک ہیلتھ انجینئر احمد مظفر لنکر پر 5.84 کروڑ روپے کی Embezlement کا ایک پختہ اِلزام تھا۔ جو ہندواڑہ کے راماہال بُلاک میں نہ پائیپیں بچھائی گئی تھیں اور نہ ہی پانی کی بہم رسائی کا کوئی انتظام تھا۔ لیکن بھاری رقومات کا خرچہ خزانہ عامرہ سے وصول کِیا گیا تھا۔ یہ واٹر سپلائے سکیم 2011 میں شروع کی گئی تھی۔ پر تین سال گذرنے کے بعد بھی اِس سیکم کا کوئی عملی وجود نہ تھا۔ صرف فرضی، بناوٹی کاغذی سیکم چلائی گئی۔

غرضیکہ عمر عبداللہ کے دور میں جعلسازی اور رُشوت خوری خوب چلی۔ فرضی سکیمیں کُچھ منظرِ عام پر آئیں اور کُچھ سکیموں کو پسِ پردہ رکھا گیا۔ کانگریس کے وادی کے منتریوں پر بھی فرقہ پرستی، کُنبہ پروری اور

اقارب پروری کے اِلزامات لگے۔ اِن کانگریسی منتریوں نے کشمیری پنڈتوں کے تابُوت میں آخری کیل ٹھوکنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اِنہوں نے ویری ناگ میں کشمیری پنڈتوں کی شمشان بھُومی پرPHE اور ٹاؤن ایریا کے دفاتر تعمیر کروائے۔ اِسی پارٹی کا منتری G.M.Mir سیکس سکینڈل میں مُلوث پایا گیا اور پیرزادہ محمد سعید منتری نے بھی بورڈ آف سکول ایجوکیشن کی رہی سہی ساکھ کو مٹانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

نتیجے کے طور پر 2015ء کے عام انتخابات میں عمر عبداللہ کی ناکامی کا خمیازہ نیشنل کانفرنس پارٹی کو بھگتنا پڑا۔ اِس سے پہلے بھی 2014ء کے پارلیمانی انتخابات میں اِس پارٹی کو منہ کی کھانا پڑی۔ عمر عبداللہ کے والد فاروق عبدالہلہ سری نگر نشست سے بُری طرح ہارے۔ بارہ مُولہ میں اِس پارٹی کے اُمیدوار شریف الدین شارق کو شکست فاش ہُوئی اور اننت ناگ سے اِسی پارٹی کے اُمیدوار کو بھی ہارنا پڑا۔ اور اُس کے فوراً بعد ہی وہ اِس پارٹی سے نِکل کر PDP میں شامل ہو گئے۔ اِس کے تقریباً تین مہینے کے بعد اسمبلی انتخابات عمل میں لائے گئے اور نیشنل کانفرنس کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ عمر عبداللہ گاندربل کی سیٹ سے یہ انتخابات لڑنے سے قاصِر رہے اور پھر سونہ وار سری نگر سے بھی ہار گئے۔ خُدا خُدا کر کے بیروہ بڈگام سے بہ مشکل چند ووٹوں سے اسمبلی اِنتخاب میں اپنی ساکھ بچائی۔ اِس ضمن میں ووٹوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

**Voter information on 16th Loksabha J&K electrors seats 6**

| | | |
|---|---|---|
| Male | = | 3791735 |
| Female | = | 3391301 other 93 |
| Total | = | 7183129 |

**Others**

| | | |
|---|---|---|
| NRI | = | 0 |
| Service | = | 59852 |
| Male | = | 1925713 |
| Female | = | 1638704 |
| Others | = | 1 |
| Postal Voters | = | 7119 |
| Total | = | 3571537 |

**Part Wise**

| **Party** | **Voters polled by the Patry** | **%valid votes by the Party** |
|---|---|---|
| BSP | 54091 | 1.53 |
| BJP | 1154220 | 32.65 |
| CPI | Nil | Nil |
| CPM | Nil | Nil |
| INC | 815510 | 23.07 |
| JKNC | 396713 | 11.22 |
| JKNPP | 43452 | 1.23 |
| JKPDP | 732644 | 20.72 |
| unregistered | 101016 | 0.29 |
| Independents | 223498 | 6.32 |

**Winning candidates cast wise margin (winning)**

Anantnag

Mehbooba Mufti (PDP) 65417 12.71%

Baramulla

Muzaffear Hussain Beigh (PDP) 29219 6.33%
Jammu
Jugal Kishore (BJP) 257280 20.10%
Ladakh
Thupson Chenog (BSP) 36 0.03%
Srinagar
Tariq Hamid Qara (PDP) 42280 13.76%
Udhampur
Dr Jitender Singh (BJP) 60976 5.91%

| | Voters Turnout % | % Voters winner out of votes polled | % of NOTA |
|---|---|---|---|
| Baramulla | 39.14 | 37.61 | 0.98 |
| Srinagar | 25.86 | 50.58 | 1.59 |
| Anantnag | 28.84 | 53.41 | 1.58 |
| Ladakh | 71.40 | 26.13 | 1.01 |
| Udhampur | 70.95 | 46.76 | 1.01 |
| Jammu | 67.99 | 49.34 | 0.35 |



# مجموعی سوچ برائے مجموعی بود و باش

اجباری ہجرت کے بعد کشمیری پنڈتوں کی سوچ اور سمجھ، خیالات و احساسات، اور زندگی کی غرض و تمایلات سبھی بدل گئے۔ یہاں تک کہ رسم و رِواج، خورد و نوش، تہواروں کے منانے میں بھی نُمایاں بدلاؤ آیا۔ کشمیر میں اِن کی باز آبادکاری میں بھی اِس بدلاؤ کا اثر پڑا۔ یعنی اب اجتماعیت کا عنصر زیادہ زور پکڑنے لگا۔ اِبتدا میں کشمیری پنڈت قوم دیہاتی اور شہری آبادی میں بٹی ہوئی تھی۔ اور جس سے اِن کی سماجی، سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور مذہبی رسُومات میں بھی ایک نُمایاں فرق دِکھتا تھا مگر ہجرت کے بعد یہ اثر یکا یک بدل گیا۔ سبھی لوگ ایک جیسے حالات اور ماحول میں زندگی گذارنے لگے اور آنے والی پود کو بھی یکساں مواقع میسر ہوئے۔ اِس طرح سے ذہنی، سماجی اور طرزِ زندگی کے پہلو بھی نمایاں طور بدل گئے۔ دھونس، خاندانی اور بناوٹی، اونچ نیچ اور اقتصادی تفاوت گھٹنے لگی۔ البتہ رہایشی پہلو میں پنڈتوں

نے کبھی بھی سمجھوتہ نہ کِیا۔ کالونی کا چُنا و سوچ و سمجھ کر کرتے رہے۔ اِس لئے سنسکار، سبھتا، آدرش وغیرہ نہ صرف قائم رہے بلکہ اِن کی سہی سمت پروان چڑھنے لگی۔ اگلی پیڑیاں جب تک اپنے اسلاف کے آدرش اور سنسکار قائم نہ رکھیں گے۔ تو یہ اگلی نسلوں تک نہیں چل پائیں گے۔ اِس لئے مجموعی رہن سہن کی اہمیت سماجی، بُو دو بقا کے لئے زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ ڈوگرہ راج میں بڑھے گوشت کی بکری پر پابندی تھی۔ یہاں تک کہ 1990ء تک یہ پابندی قائم رہی۔ اُسکے بعد کھُلے عام اِس کا استعمال ہو رہا ہے۔ جس سے کشمیری پنڈتوں کو پُرانے رہن سہن میں یقین نہیں رہا۔ کشمیر میں پہلے سے ہی اقلیتی فرقے کے لوگوں کو مجموعی زندگی بسر کرنے کی مجبوری رہی ہے۔ اور ماضی میں بھی انہوں نے مجموعی رہائش کو تقویت دے کر ارمان محسوس کِیا ہے۔ اور اِس مجموعی رہائش کو ایک اخلاقی اور سماجی پہچان حاصل ہو چکی ہے۔ پہلے بھی کشمیری پنڈت حبہ کدل، بھڈیار، گنپت یار، جواہر نگر، وزیر باغ، کرن نگر، رعناواری وغیرہ علاقوں میں اجتماعی طور آباد تھے۔ اِسی طرح اہل تشیعہ فرقہ نے زڈی بل، حسن آباد، بڈگام، سُنبل وغیرہ علاقوں میں اجتماعی رہائش کو فوقیت دِی اور فرقہ جعفری سے مُنسلک لوگ اجتماعی رہائش کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جموں میں بھی مسلم فرقہ نے بٹھنڈی، نروال وغیرہ میں مجموعی بستیاں بسائی ہیں۔

اب جب باز آبادکاری اور واپسی کی بات زیرِ بحث آتی ہے اور

کشمیری پنڈت اجتماعی بازآبادکاری کی بات کرتے ہیں تو غیر ضروری سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ پچھلے پانچ سو سال میں متعدد بار اِس فرقے کی اجباری ہجرت کے واقعات پڑھنے سُننے سے رونگٹے کھڑا ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر کے اِن کی ثقافتی وراثت کو محفوظ رکھنے کے لئے بے معنی شکوک وشبہات اُٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

آج کل حکومت جیولجی کے ماہروں کی خدمات حاصل کر کے لوگوں کو محفوظ جگہوں پر آباد کرنے اور بسانے کے منصوبے تیار کر رہی ہے۔ کیونکہ زمین کے کھسکنے، بھونچال اور بادل پھٹنے کے امکانات روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ گلوبل وارمنگ اور دیگر آفات سماوی کے خطرات بڑھ رہے ہیں۔ اِس وجہ سے بھی کشمیری پنڈتوں کا اجتماعی طور رہنا خدشات کی نگاہوں سے نہ دیکھا جائے۔ کیونکہ یہ قوم بار ہا فرقہ وارانہ فسادات کا شِکار ہوتی رہی ہے۔ امن و شانتی کی تلاش میں انہیں وادی سے کوچ کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

1986ء کے بعد وادی میں اِن کے خلاف ایک پس پردہ سازِش چلائی گئی۔ اور اِس قوم کی بُنیادوں کو ہلا یا گیا۔ اگر باریکی سے دیکھا جائے تو اِن کی بیخ کنی کی گئی۔ اب گذشتہ تقریباً 27 سال سے یہ قوم اپنی زادگاہ یعنی وادی میں لوٹنے کی تگ و دو کر رہی ہے۔ مگر ریاستی اور مرکزی سرکار نے اِن کے ساتھ کسی بھی طرح کے تعاون کا ثبوت نہیں دِیا۔ اور نہ ہی اِن کے بُنیادی مسایل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ کے طور پر یہ فرقہ سرکار کو

اپنا بہی خواہ نہیں سمجھ رہا ہے۔ ریاستی سرکار اِس قدر تعصب کی دلدل میں گر چُکی ہے کہ اِس نے اِرادتاً پنڈتوں کو بُنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ مرکزی حکومت کی منظور شدہ اِمدادی سکیموں کی عمل درآمد میں روڑے اٹکائے۔ اِس میں سرکاری ملازمتوں کی مرکزی پیکیج کا بھی ذِکر ہے۔ پنڈتوں کے لئے تعلیم یافتہ بے روزگار بچے حصول روزگار کے لئے دوسری ریاستوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ اِدھر اُن کے بُزرگ والدین بچوں سے الگ تھلگ پڑے ہوئے ایام پیری میں مصیبت جھیل رہے ہیں۔ اِسطرح سے بھی سماج میں ایک بحران نمودار ہُوا ہے۔ اِس فرقے کو سب سے بڑا صدمہ کشمیری اکثریتی فرقہ کے لوگوں کی طرف سے اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اِن کی واپسی اور مجموعی بازآبادکاری پر رضامند نہیں ہیں۔ بلکہ کشمیر کے صوفی سنتوں کا دیا سرمایہ کوکٹر پنتھوں کی نظر جا رہا ہے۔ گویا کشمیر میں اِسلامی شریعت کی حکومت اور سماج بنانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ اِن کا ماننا ہے کہ پنڈتوں کی منصوبہ بند واپسی اِن کیلئے موزون نہیں۔ ہمیں اسلامی شریعت سے کوئی عناد یا تضاد نہیں۔ ہمارا ماننا صرف یہ ہے کہ شریعتی حکومت غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ دینے سے قاصر ہے۔



---

۱۔ اِس فرقے کو کامیابی کی مسافت کا پتہ ہی نہ لگ رہا ہے۔ کہ منزل کے حصول کے لئے کس رفتار سے چلیں۔

۲۔ سیکولر یعنی کثرت میں وحدت کا معمہ پھر سے کھڑا ہو کر اِن کے لئے مصیبت کھڑا کر دے گا۔

# اب کیا کرنا چاہیے؟

میں اُس کشمیری پنڈت سے خوش ہوں جو یہ سوال ہر مجلس اور ہر محفل میں پوچھے۔ بجائے اسکے کہ ہم ماضی کے زخموں کو بار بار تازہ کریں اور اپنی تعمیری صلاحیت کو مفلوج کریں ہمیں آیندہ کا سوچنا چاہیے یعنی ہمیں آنے والی نسلوں کیلئے کچھ سُودمند باتیں کہنی چاہیے۔

چونکہ کشمیری پنڈت ''نہ جائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی صُورتِ حال سے دُوچار ہیں۔ کشمیر کے زمینی، سماجی، سیاسی اور تمدنی حالات اِتنے بدل چکے ہیں کہ اب خالص کٹر پنتھی اسلام کا دور دورہ ہے۔

اِسی وجہ سے انٹرلگیوسٹرس نے بھی اپنی حتمی رپورٹ میں باقی سفارشات کے علاوہ پنڈتوں کے لئے Concentrated جگہ پر بسانے کی سفارش کی تھی۔ جس کا نام نوا سرینگر تجویز کیا گیا۔ یہ رپورٹ UPA-I حکومت کو 2014 میں سُپرد کی گئی۔ اِس وفد نے پنڈتوں کے لئے

کا Internally Displaced People Status دینے کی سُفارش بھی کی تھی۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق بھی پنڈت Internally Displaced لوگ ہیں اور ''مہاجر'' کا نام اِن کے ساتھ جوڑنا سراسر نا اِنصافی ہے۔

پنڈتوں نے بارہا منجملہ طور پر ریاستی اور مرکزی سرکار کو اِس حوالے سے عرضداشت پیش کیں مگر اِن حکومتوں کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی۔

دوسری جانب عرب ممالک سے کٹر پنتھی ڈھانچہ اُستوار کرنے کے لئے اور مقامی جوانوں کو دہشت گردی میں شامل کرنے کیلئے مسلسل اور متواتر رقومات درآمد کی جا رہی ہیں۔ ان ہی رقومات سے نئ مساجد، درسگاہ، سڈڈی سرکل قائم کئے جا رہے ہیں۔ سیکورٹی ایجنسی سے چشم پوشی کرنے کے لئے یہ رقومات درجہ بدرجہ تھوڑی مقدار میں ہی بھیج جا رہے ہیں۔ اِن رقومات کے بھیجنے سے مقامی جوان دہشت گردی میں شامل ہوکر ایک نیا انقلاب بپا کر رہے ہیں۔ ترال، یاری پورہ، بٹہ پوری، جنوبی کشمیر کے علاقوں میں مقامی دہشت گردوں کی تعداد میں ہوش رُبا اِضافہ، مشاہدے میں آیا ہے۔ ایسی صورت حال سے تیئس سال کی طویل مُدت کے بعد بھی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اِس لئے یہ کہنا واجب ہے کہ ''کشمیری پنڈت : داستان دار و رسن'' اپنے انجام کو پہنچانے کی ریاستی اور مرکزی سرکارئیں کام کر رہی ہیں۔

میں نے بار ہا اِس بات پر غور وفکر کِیا ہے۔ کشمیر سے ہمارا رشتہ اب تاریخ کے پنوں میں ہی ملے گا۔ اسلئے ہمیں عملی زندگی کی بات کرنی چاہیے۔ اب ہم بکھر گئے ہیں سارے ہندوستان میں۔ اگرچہ ابھی تک ہماری بڑی تعداد جموں میں ہی مستقر ہے لیکن ہم لوگ اگلے بیس برسوں میں جموں سے غایب ہو جاینگے۔ ہماری نئی پود تعلیم اور نوکری کی اور ضرورت میں ملک کے دوسرے حصوں میں بلاخوف و خطر جا رہی ہے۔ ٹرینگِ کرتے ہیں نوکریاں ملتی ہیں۔ شادی کشمیری یا غیر کشمیری عورت سے یا مرد سے کرتے ہیں اور اپنی دُنیا بسا لیتے ہیں۔ انہیں کوئی سیاسی اور سماجی رکاوٹ نہیں ہے کیونکہ سماج بکھرا ہُوا ہے۔ اسلئے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا غیر کشمیری ممبر سے شادی کرنا ایک عام بات بن چکی ہے۔ اگلے بیس یا تیس سال میں کشمیری پنڈت قوم کا 80 فیصد حصہ غیر کشمیری قومیت میں مدغم ہو چکا ہوگا۔ اور اسکے ساتھ تمام دیگر مسایل اور سماجی رسومات اور آداب اور سنن بدل جاینگے۔ انہیں کشمیر وادی کا کوئی تصور نہیں ہوگا اور نہ تلاش ہوگی۔ تاریخ کا یہی دستور رہا ہے۔ اور اِس پر آنسو بہانا بے معنی ہے۔

اب میری خواہش یہ ہے کہ جس جس کشمیری تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ نوجوان کو امریکہ، آسٹریلیا یا یورپ جانے کا موقعہ ملے اُسے ضرور اُس موقعہ کو لے کر اُسکا فایدہ اُٹھانا چاہیے بخصوص گاؤں کے نوجوانوں کو۔ لیکن انہیں ایک وعدہ کرنا چاہیے کہ وہ مغربی ممالک بخصوص امریکہ میں سکونت

اختیار کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، دوستوں، ہمسایوں اور جانے پہچانے لوگوں کو جو برادری سے تعلق رکھتے ہوں انہیں جس طرح بھی ممکن ہو امریکہ لے جائیں۔ ایک وقت آئے گا اگلے پچاس سال میں کہ ہماری سب سے زیادہ آبادی امریکہ میں ہی ہو گی۔ جو کشمیری پنڈت صاحبان ہمارے 1990ء کے اخراج سے پہلے امریکہ جا چکے ہیں اُن سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ وہ کسی اور خصلت کے پُتلے ہیں اور ہمیں تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے اِنخلا کے بعد جو لوگ چلے گئے وہ ہماری مصیبت اور جدو جہد سے آشنا ہیں اور اِن میں ابھی تک ہمدردی کا جذبہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل بہت سارے بے معنی رسومات سے رفتہ رفتہ آزاد ہو جائینگے کیونکہ ان کے پاس ان رسومات کی انجام دہی کا وقت نہیں ہوگا۔ اُنھیں اپنی تاریخ کو پڑھنے کا نہ تو شوق ہوگا اور نہ وقت ملے گا۔ اسلئے تاریخ سے واقفیت چند ہی گِنے چنے لوگوں کے بس کی بات ہوگی اور اس طرح ہماری اگلی قوم عصرِ حاضرہ کی بین الاقوامی قوم کا حصہ بن جائیگی۔ اُنکی نئی شناخت اور نئی شخصیت ہوگی۔ اِن کی زبان انگریزی امریکی زبان ہوگی اور وہ چونکہ مالی طور خوشحال ہونگے اسلئے تفنن طبع کیلیئے گاہ گاہی دو تین سال میں ایک آدھ بار کشمیر کی سیاحت پر آئینگے اور اکثر سیاحوں کی طرح واہ واہ کے الفاظ مُنہ سے نکالینگے اور واپس جا کر اپنے دوستوں سے ہی کہیں گے کہ کشمیر خوبصورت جگہ ہے ہر چند کہ اگلے

بیس یا تیس برسوں میں کشمیر دُنیا کی ایک بدزیب اور گھناونی جگہ بن چکی ہو گی۔ کیونکہ کلچر اور مذہبی جنون زدگی کے درمیان ایک عظیم خلیج ہے۔

میرے خیال میں ہماری آنے والی نسل ہم سے کئی گنا بہتر اور آرام دینے والی باعزت زندگی بسر کریگی کیونکہ وہ اسلامی انسانیت دُشمن ماحول میں نہیں پلی ہوگی جس طرح ہم پلے تھے۔ ان کیلیئے ترقی کے مواقع بہت زیادہ ہونگے۔

ایک بات کا مجھے افسوس رہے گا کہ ہماری برادری کے لوگ جواب ہندوستان کے مختلف شہروں میں بس چکے ہیں وہ مقامی سیاسی زندگی سے کٹ کر رہنگے جو ایک غلط اور نقصان دہ بات ہے۔ بہت کم ہیں جو سیاست کے میدان میں کُود کر اپنا سیاسی مقام پیدا کرینگے اور ان کو پھر پتہ چلے گا کہ قوت اور بخصوص سیاسی قوت کا سرچشمہ کیا ہوتا ہے۔ سینکڑوں برس کی غلامی نے اِن کی قوتِ ابتکار (initiative) کو مفلوج کر کے رکھدیا ہے۔ وہ عوام سے آکر اور عوام میں گُھل مِل کر ایک بڑے سماج کا حصہ بننے سے کتراتے رہینگے۔ یہ ایک بڑی بھُول اور ضرر رسان بات ہوگی کہ وہ سیاست سے دُور رہ جاینگے اور اس طرح پاوٗر کے مرکز سے دور رہینگے۔

دوسری خامی جو ہمارے نوجوان طبقہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا یگی یہ ہے کہ یہ لوگ صرف کمپوٹر اور انجینئرنگ یعنی تکنیکی تربیت کے درپئے ہیں اور اُن کاوٗشوں کو جو طاقت اور رسُوخ کا سرمایہ ہوتے ہیں اُنکی طرف اِن

کی توجہ نہیں جاتی ہے۔ کتنے نوجوان ہیں جو IAS / IFS / IPS / IRS وغیرہ جیسے نہایت اہم منصبوں کی تلاش کرتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے با اِستعداد جوان جنہیں کافی صلاحیت ہے کہ IAS / IFS وغیرہ امتحانات پاس کریں اس طرف اپنا دھیان مبذول نہیں کرتے اور قوم کی خدمت کا ایک بڑا موقعہ ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔ کاش ہمارے ایک سو جوان اونچی سول سروس میں بھرتی ہو جائیں منجملہ پولیس، ریلوے اور آرمی تو اِس پوری ہندوستانی قوم کی قسمت بدل جائے گی۔ میں اپنے نوخیز جوانسال طبقہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ UPSC کے امتحانات میں بھرپور حصہ لِیا کریں۔ کیا ہمارے جوانوں میں جنوبی ہند یا بہار یا دہلی کے نوجوانوں سے کمتر صلاحیت ہے کہ وہ اِن امتحانات میں اپنا اعلیٰ مقام نہیں پا سکتے۔ ایسا نہیں ہے۔ کوتاہی ہم میں ہے۔

اور آخری بات میں چاہتا ہوں اور ہر کشمیری پنڈت چاہتا ہے کہ جواں لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی اپنی ہی برادری کے حلقوں میں ہو اور اُس سے باہر نہ ہو۔ لیکن زمینی حالات کچھ اور ہیں ۔ وہ ملک کے دوسرے شہروں میں تحصیلِ علم اور ٹریننگ کیلئے جاتے ہیں۔ وہ کھُلے معاشرے میں گھُل مِل جاتے ہیں۔ اپنی پسند کا لڑکا یا لڑکی پاتے ہیں اور محبت کے رشتہ میں بندھ جاتے ہیں اور پھر اس حال سے باہر آنا ناممکن ہوتا ہے۔ ایسا ہوگا اور اِسکو ہم روک نہیں سکتے۔ ایک فطری اور ناگزیر بات ہے۔ ہاں لڑکے

لڑکی کو باہر جانے سے پہلے کچھ تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ کسی ہمجنس کے انتخاب سے پہلے اِسکے اصلی گھریلو اور معاشرتی یا سوشل حالات سے باخبر ہوں تا کہ کہیں دھوکا نہ کھا جائیں۔ ایسا کئی بار ہُوا ہے اور بے راہ روی بھی ہوئی ہے۔ لیکن حقیقتِ امر یہ ہے کہ اِس سلسلہ کو بالکل روکنا ناممکنات میں ہے۔



# اِظہارِ تشکُر

اِس کِتاب کی تکمیل میں مجھے کئی شخصیتوں نے رضا کارنہ طور پر مدد دی جن کا میں تہہ دِل سے شُکُر گذار ہوں۔ اِن میں خاص طور پر شری اوتار کرشن کول بڈگام حال شیل نِواس پاٹا پلوڑہ جموں، شری گوکل ڈینبی، نصیب نگر جانی پور جموں اور شری وِجے کاشکاری سُبھاش نگر جموں قابلِ ذِکر ہیں۔

مُصنِف

